جلد 67 شمارہ نمبر 10 اکتوبر 2014ء

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: سیلاب کی تباہ کاریاں	ادارہ	3
عیدالضحیٰ	غلام احمد پرویز	5
ن س خ	لغات القرآن	9
پرویز صاحب کا نظریہ حدیث وسُنّت	ملک منظور حسین لیل	14
متحرک نفسیات	راجہ عبدالعزیز	24
وحی خفی کا محکیٰ عنہٗ روایات میں موجود نہیں ہے	خواجہ ازہر عباس	32
الھدایۃ والعرفان فی تفسیر القرآن بالقرآن	آصف جلیل	38
تاریخ پاکستان کے گم گشتہ حقائق	ادارہ	44

ENGLISH SECTION

Surah *Al-Mursalaat* – Durus-al-Qur'an By G.A.Parwez

Parah 29: Chapter 29 Translated by: Dr. Mansoor Alam 51

دفتر کا پتہ B-25 گلبرگ 2، لاہور۔54660، پاکستان

فون: 042-35714546

E-mail: idara@toluislam.com

ناشر و چیئرمین

محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق ۔ ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی

محمد سلیم اختر

قانونی مشیر

ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

زرِتعاون

پاکستان میں 40 روپے فی پرچہ

سالانہ -/450 روپے

بیرون ملک 2500 روپے سالانہ

بینک اکاؤنٹ نمبر

3082-7 نیشنل بینک آف پاکستان، مین مارکیٹ گلبرگ

برانچ کوڈ (0465) ۔ لاہور

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

Naveed Graphic 5.5x8

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادارہ

لمعات

سیلاب کی تباہ کاریاں

لَاعَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ (11:43) ''آج اس ابتلاء سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی'' کا جیتا جاگتا منظر آنکھوں کے سامنے آ جائے' قوموں کی زندگی میں ایسے حوادث کم آتے ہیں' لیکن قوم اور قوم میں فرق ہوتا ہے۔ اس طرح کے طبعی حوادث زندہ اقوام پر بھی آتے ہیں۔ اول تو انہوں نے اپنی پیش بینی سے پہلے ہی احتیاطی وحفاظتی تدبیریں اختیار کر رکھی ہوتی ہیں اور اگر معاملہ ان کی حد سے بڑھ جائے تو پوری قوم اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور متاثرین کو اس طرح سنبھال لیتی ہے کہ ان کو اپنے نقصان کا احساس تک نہیں ہوتا۔ حادثہ کے گزر جانے کے بعد عمائدین قوم سر جوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور غور وفکر کرتے ہیں کہ ہماری تدابیر میں کیا کمی رہ گئی تھی اور اس کو آئندہ کیسے پورا کیا جا سکتا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ نہ ''عوام'' کو اس کا خیال ہے کہ ایسے حادثات وسانحات کا کوئی مستقل حل سوچنا چاہئے اور نہ ''لیڈروں'' کو اس کا احساس کہ زندگی کو کسی ڈھب پر گذارنے کی شکل پیدا کرنی چاہئے۔ آج سے پچاس سال قبل ''طلوع اسلام'' نے انہی صفحات پر' سیلاب کے تباہی مچانے کے بعد' ان الفاظ میں اربابِ حل وعقد کے سامنے دردمندانہ گذارش کی تھی اور بعد میں بھی بار بار دہراتا رہا کہ:

> ''اگر ہمارے ہاں خدمتِ خلق کے لئے ادارے موجود ہوں تو خدمت کا سلسلہ فی الفور شروع کیا جا سکتا ہے یہ ایسی کمی ہے جو ہمیں آفات وحوادث کے وقت بے چارا سا بنا دیتی ہے اور ہمارے نقصانِ جان ومال میں اضافہ کا باعث بنتی ہے۔ اگر اب بھی اس نکتہ کو سمجھ لیا جائے اور ایسی (تربیت یافتہ کارکنان پر مشتمل) تنظیمیں قائم کر لی جائیں تو ملک کو بہت سے غیر ضروری مصائب سے بچایا جا سکتا ہے۔''

لیکن افسوس ہے کہ ہم آج بھی اسی مقام پر ہیں جہاں پر نصف صدی قبل کھڑے تھے۔

باقی رہے ہمارے مذہبی راہنما' سو جب کبھی اس طرح کے حوادث آتے ہیں تو وہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان اور قوم کو تسکین دے لیتے ہیں کہ سب ہمارے گناہوں کا نتیجہ ہے۔ کہنے کو تو وہ ہمارے گناہ کہتے ہیں لیکن اس سے ان کی مراد ہوتی ہے ارباب حکومت و

قیادت کے گناہ۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہی وہ طبقہ ہے جو فسق و فجور میں مبتلا رہتا ہے اور اسی کی وجہ سے خدا کا عذاب آتا ہے۔ یہ خیال کہ طبعی حوادث' آندھیاں' سیلاب اور زلزلے خدا کا عذاب ہیں جو ہمارے گناہوں کی وجہ سے ہم پر نازل ہوتا ہے اس قدر عام ہے کہ اس سے متعلق اکثر ہم سے لوگ پوچھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم کو اس طرف آنے ہی نہیں دیا جاتا کہ فطرت کے حوادث کا علاج قوانینِ فطرت کے مطابق ہوتا ہے جس کے لئے تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ برعکس اس کے قوم کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ یہ مصیبت خدا کی طرف سے ہے اس لئے کوئی ان کی روک تھام نہیں کرسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان طبعی حوادث کو انسانوں کی نیکی اور بدی سے کوئی تعلق نہیں ہے اس میں کفر و ایمان کو بھی کوئی دخل نہیں ہوتا۔ قرآن کریم نے تسخیر فطرت کو آدمی کے لئے عام بتایا ہے۔ **سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا**۔ یعنی کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اسے ہم نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ اس کا مخاطب آدمی ہے کوئی خاص گروہ نہیں ہے۔ اس لئے دنیا کی جو قوم بھی چاہے تسخیر فطرت کرسکتی ہے' جو قوم ایسا کرے گی وہ طبعی حوادث کی تباہ کاریوں سے محفوظ ہو جائے گی اور جو ایسا نہیں کرے گی نقصان اٹھائے گی۔

قرآن نے زندگی کی ایک سطح حیوانی بتائی ہے۔ حیوان فطرت کو تسخیر نہیں کرسکتا۔ ایک درجہ آدمیت کا ہے۔ آدمی تسخیر کرسکتا ہے۔ تیسرا مقام مومن کا ہے جو متاعِ فطرت کو نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے عام کرتا ہے۔ کوئی مقامِ مومن تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ مقامِ آدم تک نہ پہنچ جائے۔ بقول اقبالؔ:

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

مقامِ مومن مشکل ہے تو ہمیں ان حادثاتِ طبعیہ سے بچنے کے لئے کم از کم مقامِ آدمیت تک آنا پڑے گا یعنی تسخیر فطرت کی صلاحیت حاصل کرنی ہوگی اور اس کے لئے قومی کردار پیدا کرنا پڑے گا۔ ہمارے لئے یہ ہیبت انگیز اور تباہ کُن سیلاب فطرت کا ایسا اشارہ ثابت ہوسکتا ہے جس کو سمجھنے سے ہم اپنی تقدیر سنوار سکتے ہیں۔ ان اشاروں کو سمجھنے کے لئے جس شعور اور جرأت کی ضرورت ہوتی ہے جب اس سے اقوام آگاہ ہوتی ہیں تو ان کی اجتماعی زندگی کے مظاہر محیر العقول ہو جاتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

غلام احمد پرویز

عیدالضحیٰ

پرویز صاحب کی وہ تقریر جو نشرگاہِ دہلی سے 29 دسمبر 1941ء کی شام کو نشر ہوئی۔ (طلوع اسلام)

مذہب کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ وہ ایک فرد کی ذاتی اصلاح کا ذریعہ ہے اس میں شبہ نہیں کہ افراد کی ذاتی اصلاح نہایت ضروری ہے لیکن یہ اصلاح اصل مقصد نہیں۔ عمدہ گھڑی کے ہر پرزہ کے لئے مضبوط اور درست ہونا ضروری ہے' لیکن اگر یہ پرزے الگ تھلگ پڑے ہوں تو ان کی پائیداری اور مضبوطی کسی کام کی نہیں۔ یہی پرزے جب ایک نظام کے تحت' ایک خاص ترتیب سے' ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں تو ان میں سے ہر پرزہ کی حرکت' دوسرے پرزوں پر اثر انداز ہوگی اور اس طرح ان کی اس مجموعی حرکت کا جیتا جاگتا نتیجہ' محسوس شکل میں' گھڑی کے ڈائل پر نمودار ہو جائے گا۔ اسلام افراد کی اصلاح سے ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے جو نظامِ انسانیت کو عدل پر چلا سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے ایک ایسا عملی پروگرام مرتب کر دیا ہے جس میں ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھتا ہے۔ نماز کے لئے پانچ وقت کا اجتماع۔ تقویٰ۔ ضبطِ نفس۔ غیر اللہ کی محکومی سے انکار۔ اللہ کی حاکمیت کا اقرار۔ مرکزیت۔ اجتماعیت۔ اطاعتِ امام کا عملی مظاہرہ ہے۔ جمعہ کے اجتماع میں یہ دائرہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔ عید کی تقریب پر اس کی حدود اور زیادہ پھیل جاتی ہیں اور بالآخر حج کے میدان میں اس کی وسعتیں ساری دنیا کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہیں۔ رمضانِ مبارک کے پورے مہینے کی مشق و ریاضت کے بعد جب ذہنوں میں جلا۔ دلوں میں تازگیٔ ایمان' نگاہوں میں مومنانہ فراست اور خون میں مجاہدانہ حرارت پیدا ہو گئی تو عیدالفطر کے اجتماع میں ہر مقام سے ملتِ اسلامیہ کی نمائندگی کے لئے بہترین افراد کا انتخاب ہوا۔ مسلم نمائندوں کے یہ قافلے دنیا کے دور دراز گوشوں سے جنگل' بیابان کوہ اور دریا کے مرحلوں کو طے کرتے ہوئے۔ **مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ** اپنی بین الملی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے چاروں طرف سے ایک مرکز کی طرف سمٹے چلے آ رہے ہیں۔ دنیا میں کوئی جماعت بلا مرکز قائم نہیں رہ سکتی۔ مسلمانوں کے فکر و نظر کا مرکز قرآن۔ اطاعت کا مرکز امیر اور اجتماعیت کا مرکز وہ بیت الحرام ہے جو ایک خدا کے ماننے والوں کے مورثِ اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقدس ہاتھوں سے وجود میں آیا اور دنیا کے بتکدوں میں خدا کا پہلا گھر کہلایا۔ **إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ** (3:96) بلاشبہ پہلا گھر جو تمام انسانوں کے لئے (بطور مرکز) بنایا گیا ہے وہ یہی ہے جو مکہ میں ہے۔ برکت والا اور تمام دنیا کے لئے ہدایت کا سرچشمہ **وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا** جو کوئی اس کے حدود میں داخل ہوا وہ امن اور حفاظت میں آ گیا۔

اسلام دنیا میں جس نظام کو قائم کرنے کے لئے آیا ہے اس کی بنا اس اصول پر ہے کہ تمام انسان ایک برادری کے فرد ہیں وہ ان تمام غیر فطری حد بندیوں کو توڑنے کے لئے آیا ہے۔ جن سے انسانوں کی یہ برادری مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ نسل کا امتیاز۔ رنگ اور زبان کا امتیاز۔۔ جغرافیائی حدود کا امتیاز اس کے نزدیک سب غیر فطری حد بندیاں ہیں۔ اس لئے خدا کے اس گھر میں جب انسان جمع ہوں گے تو باطل کے ان امتیازات میں سے کوئی امتیاز باقی نہیں رہے گا۔ چینی۔ جاپانی۔ ہندی۔ افغانی۔ ایرانی۔ تورانی۔ حبشی۔ افرنگی سب ایک ملت کی شکل میں اس عظیم الشان حقیقت کا اعلان کرنے کے لئے جمع ہوں گے کہ

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

یہی نہیں بلکہ۔ مختلف قسم کے لباسوں سے جو اعلیٰ اور ادنیٰ کے امتیاز کی جھلک نمودار ہو سکتی ہے اسلام نے اسے بھی روا نہیں رکھا اور حکم دے دیا کہ ارضِ حرم میں داخل ہونے سے پہلے سب ایک ایک بن سلی چادر میں لپٹے ہوئے حاضر ہوں۔ تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری ۔ یہ ہے وہ وردی جو اسی بین الملی کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کے لئے تجویز کی گئی ہے۔ یوں باطل کے ہر امتیاز کو مٹاتے' وحدت کے رنگ میں رنگے یہ قافلے چاروں طرف سے' اپنے مرکز کی طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ سب ایک آقا کے غلام' ایک حاکم کے محکوم' ایک قانون کے تابع' ایک نظام کے پابند' فقیرانہ لباس' ننگے سر' گدایانہ وضع' قلندرانہ ادائیں' سکندرانہ جلال۔ دنیا بھر کے آستانوں سے بے نیاز' مستانہ وار گذرتے ہوئے ایک کی چوکھٹ پر سر جھکانے کے لئے بے تاب۔ دل وفور شوق سے بے قرار' آنکھیں مئے توحید سے نشہ بار لبیک اللھم لبیک کہتے ہوئے یوں رواں دواں' جانب مرکز کھنچے چلے آ رہے ہیں جیسے شہد کی مکھیاں' رنگ و بو کی فضاؤں کے جوہر اپنے سینوں میں بھر کر سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے شام کے وقت اپنے چھتے کی طرف پروانہ وار اڑتی چلی آ رہی ہوں کہ اپنی محنتوں کا سرمایہ' تگ و دو کا ماحصل۔ مرکز میں لا کر اکٹھا کر دیا جائے۔

زمانۂ ابراہیمیؑ میں رواج تھا کہ عہد و پیمان کی پختگی کے لئے ایک پتھر پر ہاتھ مارتے تھے۔ جب ان رہروانِ منزلِ شوق کے قافلے۔ حریمِ کعبہ میں پہنچے تو اس عہد و پیمان کی تجدید کے لئے جو انہوں نے اپنے اللہ سے باندھ رکھا ہے۔ حجر اسود کو چُھوا۔ بعض نے ہجوم کی وجہ سے دور ہی سے اشارہ کر دیا۔ کسی نے پیمان کے تقدس کی رعایت سے ہاتھ کو چوم لیا اور یوں اس عہد کی تجدید ہوئی کہ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ۚ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ میری نماز۔ میرا حج۔ میرا جینا۔ میرا مرنا سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام کائنات کا پروردگار ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں خدا کے فرمانبرداروں میں سب سے پہلا فرمانبردار ہوں۔

اس عہد و پیمان کی تجدید سے' وجد و مسرت اور سرمستی و شیفتگی کی وہ کیفیت طاری ہوئی کہ والہانہ انداز میں خدا کے اس گھر کے گرد' پروانہ وار گھوم رہے ہیں۔ کوئی کعبہ کی چوکھٹ پر سر رکھے محوِ نیاز ہے' کوئی اس کا غلاف تھامے عالمِ وارفتگی میں جھولی پھیلائے کھڑا ہے۔ دل میں مقدس آرزوؤں کا ہجوم۔ آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو۔ لب پر دعائیں۔ محویت کا عالم۔ آسمان سے نور کی بارش۔ رحمتوں کا

نزول۔غرضیکہ ایک نئی دنیا اور ایک عجیب سماں ہے۔

خمخانۂ حجاز کے متوالوں کے یہ قافلے 8 تاریخ کو عرفات کے میدان کی طرف روانہ ہو گئے۔ پاک اور صاف' سر سے پاؤں تک للّٰہیت میں ڈوبے ہوئے۔قدم وادیٔ مکہ میں۔نگاہیں عرشِ معلیٰ پر' کوئی تیز گام کوئی آہستہ خرام۔کشاں کشاں' 9 تاریخ کو اس میدان میں آ جمع ہوئے۔کیسا حسین نظارہ ہے۔سب ایک آقا کے غلام' ایک ملت کے فرد ایک ہی وضع' ایک ہی انداز' بھائی سے بھائی ملا۔ایک کا دوسرے سے تعارف ہوا کہ اس مقام کا نام ہی عرفات کا میدان ہے' اجتماع کیا ہے؟ مساوات اور محبت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔جس میں ہر قطرہ' اپنے آپ کو خود سمندر محسوس کرتا ہے۔یہ سب خدا کے حضور جمع ہوئے۔ان کا منتخب امام منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آیا۔اس نے ملت کی اجتماعی حالت پر تبصرہ کیا اور سال بھر کے لئے ایک مرتب شدہ پروگرام کا اعلان کر دیا۔جس کی تکمیل کے لئے دعائیں مانگی گئیں' التجائیں کی گئیں اور یوں یہ عظیم الشان اجتماع۔زندہ آرزوؤں کی ایک نئی دنیا اپنے جلو میں لئے۔دوسری صبح منیٰ کے میدان میں آ گیا۔یہی وہ میدان ہے جہاں ملتِ حنفیہ کے پیشوائے اعظم۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنے کے لئے پیشانی کے بل لٹا دیا تھا اور یوں اپنے ایمان محکم کا عملی ثبوت دیا تھا کہ تیرا حکم ہو تو عزیز ترین متاع بھی بلا تامل نثار کر دی جا سکتی ہے۔اس صحرائی قربانگاہ میں پہنچ کر ملتِ اسلامیہ کے ان نمائندوں نے اس اقرار کو دہرایا کہ تیرا نام بلند کرنے کے لئے جو پروگرام مرتب ہوا ہے اس کی تکمیل میں جس قربانی کی ضرورت ہو گی۔ بلا دریغ کر دی جائے گی۔ یہاں پہنچ کر مختلف ملکوں کے نمائندوں نے اپنے اپنے خیمے لگائے۔ یہ سب اللہ کے مہمان ہیں اس لئے خود ہی مہمان اور خود ہی میزبان ہیں آج صبح ہندی مسلمانوں کے ہاں سب کے کھانے کا انتظام ہے شام کو ایرانیوں کا اہتمام ہے۔ان دعوتوں کے لئے قربانیاں کی جا رہی ہیں۔سامان تو کھانے پینے ہی کا ہے لیکن چونکہ وہ مقصدِ عظیم جس کے لئے یہ اجتماع ہوا ہے خالصتاً اللہ کے لئے ہے اس لئے یہ دعوتیں بھی دنیا کی دعوتوں سے نرالی ہیں۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ (22:37) اللہ تک ان قربانیوں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ بلکہ تمہارے دل کا تقویٰ۔ پاکیزگی مقصد پہنچتی ہے۔اس نے ان جانوروں کو اس طرح تمہارے لئے مسخر کر دیا کہ تم اللہ کی راہنمائی پر اس کے نام کو بلند کرو۔اور نیک کرداروں کے لئے بشارت ہے۔دعوتیں اور ضیافتیں ہیں۔ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملک والوں کو اپنے مقامی حالات سے آگاہ کر رہے ہیں' دماغی اور قلبی تعارف ہو رہا ہے۔ادھر ادھر مختلف ملکوں کی مصنوعات کی نمائش لگ رہی ہے۔خرید و فروخت ہو رہی ہے۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ (2:198) اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم (حج میں) اپنے رب کا فضل (یعنی معیشت) کماؤ۔اس طرح یہ اجتماع ملت اسلامیہ کے لئے دینی اور دنیاوی۔ سیاسی۔ اقتصادی۔ معاشی۔ معاشرتی فوائد کا ذریعہ بن رہا ہے کہ حج کا مقصد یہی ہے لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ تا کہ لوگ اپنے فوائد کے لئے حاضر ہوں۔

تین دن تک یہ اجتماع رہا جس میں عالم اسلامی کے ہر گوشے اور ملت اسلامیہ کے ہر شعبے کے متعلق باہمی تبادلہ خیالات ہوا۔ ادھر یہ ہو رہا ہے۔ ادھر تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ملت کے افراد۔ اپنے اپنے ہاں وادیٔ مکہ کے اجتماع سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے عیدگاہوں میں جمع ہو رہے ہیں۔ ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے نیز اس پروگرام کو سننے کے لئے جس کا اعلان ایک دن پہلے میدان عرفات میں ہوا ہے۔ اس پروگرام کی اطلاعیں ریڈیو، ٹی وی اور تار برقی سے تمام عالم اسلامی تک پہنچ چکی ہیں۔ مقامی مسلمان عیدگاہوں میں پہنچے۔ اپنے اپنے خطیبوں سے اس پروگرام کو سن لیا اور سمجھ لیا جس پر اب سال بھر عمل کیا جائے گا۔ وہ تھا حج یہ ہے عید۔ وہ فریضۂ مقدس جس میں نوعِ انسانی کے قیام و بقاء کا راز ہے۔ تمام انسانوں کا اس لئے کہ مسلمان دنیا میں اپنے ہی لئے نہیں جیتا بلکہ اس کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ تمام دنیا کو اس نظام پر چلائے جس سے انسانیت بڑھے۔ پھولے۔ پھلے اور عروج و ارتقاء کی منزلیں طے کر کے اس منزل سے اگلی منزل میں جا پہنچے۔ حج اس نظام کی سب سے اہم کڑی اور کعبہ اس نظام کا مرکز ہے۔ **جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ** (5:97)۔ اللہ نے کعبہ کو جو حرمت کا گھر ہے تمام انسانوں کے لئے (امن و عافیت کے) قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔ انسانوں نے مختلف خطوط پر مختلف قسم کی جمعیتیں بنا بنا اور بگاڑ بگاڑ کر مختلف تجربے حاصل کئے ہیں اور ہر تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ۔۔۔ تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی۔۔۔ یہ سب اس لئے کہ جن اصولوں پر یہ جمعیتیں بنائی گئیں وہ سب غیر فطری تھے۔ فطرت کے مطابق تو ایک ہی اصول ہے اور وہ یہ کہ انسانوں کی تقسیم ملکوں اور قوموں کی رو سے نہ کی جائے بلکہ تمام انسانوں کو ایک عالمگیر برادری تصور کر کے انہیں ایک مرکز کے ماتحت خدا کے قانون کے تابع رکھا جائے۔ یہی وہ عظیم الشان اصول ہے جس کی رو سے مکہ کو ''**هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ**'' تمام دنیا کے لئے ہدایت کا سرچشمہ اور کعبہ کو ''**قِيٰمًا لِّلنَّاسِ**'' تمام نوعِ انسانی کے قیام کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ اس جمعیت آدم کا فطری نتیجہ ہے دنیا کا امن و سکون۔ **وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا** جو اس میں داخل ہوا۔ امن و حفاظت میں آ گیا حج اور عید اسی منزل کے نشانِ راہ ہیں۔

☆.....☆.....☆

PROPERTY FOR SALE

25 - B, Gulberg 2, (Ch. Zahoor Elahi Road) Lahore
(Adjacent to Tolu-e-Islam Trust Building) Area: 2 Kanal Plus -- Corner Plot
Interested parties may contact for further details:

Nadeem Pervaiz: 03334118829
Saleem Pervaiz: 03249883033 (NO Property Dealers Please)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لغات القرآن

ن س خ

نسخ کے معنی ہیں ایک چیز کو مٹا دینا اور اس کی جگہ دوسری چیز کو لے آنا۔ دوسری چیز کو اس کے قائم مقام کر دینا (ابن فارس)۔ **نسخت الشمس الظل** ۔ آفتاب نے سایہ کو ہٹا دیا اور اس کی جگہ روشنی لے آیا۔ یا کسی چیز میں تبدیلی کر دینا۔ **نسخت الریح آثار الدیار**۔ ہوا نے آبادی کے آثار (نشانات وعلامات) کو تبدیل کر دیا (یعنی وہ کھنڈرات وغیرہ جن سے آبادی کا پتہ نشان ملتا تھا انہیں ریت سے ڈھانک کر دگرگوں کر دیا)۔ **نسخ الکتاب** ۔ ایک کتاب کو نقل کر کے اس جیسی دوسری کتاب مرتب کر لینا۔ اسی سے **النسخة** منقول (Copied) کتاب کو کہتے ہیں (تاج۔ محیط وراغب)۔ قرآن کریم میں ہے اِنَّا کُنَّا نَسْتَنْسِخُ (45:29)۔ ''ہم لکھوا لیتے تھے''۔ مٹا دینے یا زائل کر دینے کے معنوں میں یہ لفظ (22:52) میں آیا ہے۔ فَیَنْسَخُ اللّٰہُ ''اللہ مٹا دیتا ہے''۔

لہٰذا **نسخ** کے بنیادی ہیں ایک چیز کی جگہ دوسری چیز لے آنا۔ اس لفظ کی اہمیت اس لئے ہے کہ ہمارے ہاں ناسخ ومنسوخ کا عقیدہ چلا آ رہا ہے اور اسے دین کے مہمات میں سے سمجھا جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ ہے بھی بہت اہم۔ اس لئے کہ اس کا غلط مفہوم دین کو اس کی جڑ سے اکھیڑ دیتا ہے اور اس کا صحیح مفہوم قرآن کو خدا کے دین کا آخری اور واحد ضابطہ ثابت کر دیتا ہے۔

ناسخ ومنسوخ کا مروجہ مفہوم یہ ہے کہ قرآن کریم میں متعدد آیات ایسی ہیں (بعض کے نزدیک ان کی تعداد پانچ سو تک ہے) جو پڑھی تو جاتی ہیں لیکن جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ پھر سن لیجئے کہ (اس عقیدہ کے مطابق) قرآن کریم میں پانچ سو کے قریب ایسی آیات ہیں جنہیں محض ''ثواب'' کی غرض سے پڑھ لیا جاتا ہے لیکن ان میں جو احکام ہیں وہ سب منسوخ ہو چکے ہیں۔ بعض احکام قرآن کریم کی دوسری آیات نے منسوخ کر دیئے ہیں اور بعض احکام احادیث نے منسوخ کر دیئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی ہے کہ بعض آیات ایسی بھی ہیں جو قرآن کریم کے اندر موجود نہیں لیکن ان کا حکم موجود ہے (مثلاً آیۂ رجم۔ یعنی زانی کو سنگسار کرنے کے حکم والی آیت)۔ اس عقیدہ کی رو سے قرآن کریم کی شکل یوں بنتی ہے کہ:

(۱) قرآن کریم میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن کے احکام تو منسوخ ہو چکے ہیں لیکن جن کی تلاوت ہوتی رہتی ہے۔ اور

(۲) ایسی آیات بھی ہیں جو قرآن کریم کے اندر تو نہیں لیکن ان کا حکم موجود ہے۔ دوسری قسم کی آیات کے لئے تو دلیل صرف روایات کی ہے۔ لیکن پہلی قسم کی آیات کے لئے خود قرآن کریم ہی کی ایک آیت سے دلیل لائی جاتی ہے۔ اور وہ آیت یہ ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (2:106)۔

اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے۔

ہم جس آیت کو بھی منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی اور آیت لے آتے ہیں۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

اس کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ خدا نے قرآن کریم میں کسی بات کا حکم دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اس نے سوچا کہ اس حکم کو منسوخ کر دینا چاہئے۔ چنانچہ اس نے ایک اور آیت نازل کر دی جس سے وہ پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔ یہ حکم اس سے پہلے حکم سے بہتر ہوتا تھا۔ واضح رہے کہ اس نئی آیت میں یہ کہیں نہیں بتایا جاتا تھا کہ اس سے فلاں آیت کو منسوخ سمجھا جائے۔ اس لئے قرآن کریم میں منسوخ آیات بھی اسی طرح سے موجود ہیں اور ناسخ آیات بھی۔ اللہ نے ان کے متعلق کہیں نہیں بتایا کہ فلاں آیت منسوخ ہے فلاں آیت سے۔ یہ تعین بعد میں روایات کی رو سے یا مفسرین کے اپنے خیالات کی رو سے کیا گیا۔ چنانچہ ان آیات کی تعداد ہمیشہ گھٹتی بڑھتی رہی۔ حتیٰ کہ شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک ان کی تعداد صرف پانچ ہے۔

باقی رہا ''فراموش کرا دینے'' کا سوال۔ سو اس کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ اللہ کی طرف سے آیات نازل ہوتی تھیں لیکن رسولؐ اللہ (معاذ اللہ) انہیں بھول جاتے تھے۔ تو پھر انہی جیسی آیات اور نازل ہو جاتی تھیں۔ یہ مراد ہے اَوْ نُنْسِهَا سے۔ اس کی دلیل میں یہ آیۃ پیش کی جاتی ہے۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ○ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ..... (87:6-7) جس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ہم تجھے پڑھائیں گے سو تو نہ بھولے گا' ہاں مگر جو اللہ چاہتا ہے۔

اس عقیدہ کی رو سے آپ دیکھئے کہ خدا' قرآن کریم اور رسول اللہ ﷺ کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ خدا کا تصور اس قسم کا کہ وہ آج ایک حکم صادر کرتا ہے لیکن بعد کے حالات بتا دیتے ہیں کہ وہ حکم ٹھیک نہیں تھا اس لئے وہ قرآن کریم کے اس حکم کو منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم دے دیتا ہے۔

قرآن کریم کے متعلق یہ کہ اس میں بے شمار آیات ایسی ہیں جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی تلاوت برابر ہو رہی ہے اور یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ کونسی آیت منسوخ ہے اور کونسی ناسخ۔ اسے لوگوں پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ خود اس کا فیصلہ کریں کہ کونسی آیت منسوخ ہے اور کونسی اس کی ناسخ۔

اور رسول اللہ ﷺ کے متعلق یہ تصور کہ حضورؐ خدا کی طرف سے نازل کردہ قرآنی آیات کو بھی بھول جایا کرتے تھے۔ یا للعجب!

ناسخ و منسوخ کا صحیح مفہوم آگے آئے گا۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى کے صحیح مفہوم کے لئے عنوان ن۔س۔ی دیکھئے جہاں اس کی تشریح کر دی گئی ہے۔

اب دیکھئے اس آیت (مَا نَنْسَخْ .....) کا صحیح مفہوم۔ پیچھے سے سلسلۂ کلام یوں چلا آتا ہے کہ اہل کتاب (بالخصوص یہود) قرآن کریم اور رسالت محمدیہؐ پر مختلف اعتراضات کرتے ہیں (قرآن کریم ان اعتراضات کا جواب دیتا ہے)۔ اسی سلسلہ میں ان کا ایک اعتراض یہ بھی تھا (اور یہ اعتراض بڑا اہم تھا) کہ جب خدا نے انبیاء سابقین (مثلاً حضرت موسےٰؑ وغیرہ) پر اپنے احکام نازل کر دیئے تھے' اور وہ احکام توریت وغیرہ میں موجود ہیں۔ تو پھر ان کی موجودگی میں اس نئے رسول اور نئی کتاب کی ضرورت کیا تھی؟ اس

آیت میں اسی اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ خدا کی طرف سے سلسلۂ رشد و ہدایت حضرت نوحؑ کے زمانے سے مسلسل چلا آ رہا ہے۔ لیکن اس کی صورت یہ رہی ہے کہ مختلف انبیاء کی وساطت سے جو وحی بھیجی جاتی تھی ان میں ایک حصہ ان احکامات پر مشتمل ہوتا تھا جو وقتی ہوتے تھے اور ان کا تعلق خاص اسی قوم سے ہوتا تھا جس کی طرف وہ احکام بھیجے جاتے تھے اور انہیں انہی حالات میں نافذ العمل رہنا ہوتا تھا جو اس زمانے کے تقاضے سے پیدا ہوئے تھے۔ بعد میں' جب وہ قوم نہ رہتی یا زمانے کے تقاضوں سے وہ حالات بدل جاتے تو ایک اور رسول آ جاتا اور وہ ان احکام کی جگہ دوسرے احکام لے آتا۔ اس طرح یہ جدید وحی اس سابقہ وحی کی قائم مقام (ناسخ) بن جاتی۔ یہ سلسلہ شروع ہی سے ایسا چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ تم خود دیکھ رہے ہو کہ توریت کے کتنے احکام ہیں جنہیں حضرت عیسےٰؑ نے آ کر بدل دیا (یہ بدلے ہوئے احکام انجیل میں موجود ہیں)۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسانیت کے تقاضے اور اس کی ذہنی سطح بھی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی اور اوپر کو اٹھتی چلی آ رہی ہے۔ اس لئے ہر قوم کو اس کے حالات اور ارتقائی سطح کے مطابق ہی احکام دیئے جاتے تھے۔ ان کی سطح سے بلند احکام و قوانین روک لئے جاتے تھے۔ تا آنکہ ان کے بعد دوسری قوم آتی جو ارتقائی منزل میں ان سے آگے ہوتی۔ تو وہ ''روکے ہوئے'' احکام وقوانین اس وقت نازل کر دیئے جاتے۔ تنزیل وحی میں یہ اصول بھی کارفرما رہا ہے۔

نیز یہ شکل بھی ہوتی کہ ایک رسول کے چلے جانے کے بعد' اس کی قوم اس کی وحی کے بعض حصوں کو ترک کر دیتی۔ بعض کو فراموش کر دیتی۔ اس لئے ان ترک کردہ یا فراموش کردہ حصوں کو (جن میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہ ہوتی) بعد میں آنے والے رسول کی وحی سے از سر نو تازہ کر دیا جاتا۔

یہود سے کہا گیا کہ وحی کا سلسلہ اس طرح چلا آ رہا ہے۔ اب وہ دور آ گیا ہے جس میں انسانی شعور پختگی حاصل کر لے گا۔ لہٰذا اب انتظام یہ کیا گیا ہے کہ۔

(۱) سابق انبیاء کی وحی کے وہ تمام احکام جو ان کی قوم کے حالات اور ان کے زمانے کے تقاضوں کے ساتھ مخصوص تھے منسوخ کر کے ان کی جگہ' دوسرے احکام وقوانین بھیج دیئے جائیں اور چونکہ وحی کا یہ سلسلہ اب ختم ہو رہا ہے اس لئے یہ احکام وقتی اور ہنگامی نہیں ہوں گے بلکہ ابدی طور پر انسانیت کا ساتھ دینے والے ہوں گے۔ اس لئے یہ احکام وقوانین سابقہ احکام سے بہتر ہوں گے۔

(۲) وہ قوانین جنہیں پہلے روک لیا گیا تھا کیونکہ ہنوز انسانیت اس سطح پر نہیں پہنچ سکی تھی کہ انہیں سمجھ سکے یا اپنا سکے' اب انہیں بھی نازل کر دیا جاتا ہے' کیونکہ قرآن کریم انسانیت کی بلند ترین سطح تک اس کا ساتھ دے گا۔

(۳) اور سابق انبیاء کی وحی کے وہ احکام وقوانین جنہیں ان کی قوموں نے ترک کر دیا تھا۔ یا فراموش کر دیا تھا (یا جن میں انہوں نے تحریف کر دی تھی) ان کی تجدید کر دی گئی ہے (ان کی مثل احکام دے دیئے گئے ہیں)۔

یہ ہے وہ ضرورت جس کے لئے ایک نئے رسول اور نئی کتاب کو بھیجا گیا ہے اور یہ ہے وہ وجہ کہ اب تمام سابقہ کتابوں کی جگہ اسی قرآن کریم پر ایمان لانا اور اس پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ اب اس کے سوا ہدایت کی کوئی اور راہ نہیں۔ **فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ**

فَقَدِ اهْتَدَوْا ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ (2:137)۔ اگر یہ بھی اسی طریق پر ایمان لائیں جس طرح (اے جماعت مومنین) تم ایمان لائے ہو تو پھر یہ لوگ ہدایت پا سکیں گے اور اگر اس راہ سے اعراض برتیں گے تو پھر خدا کے راستے کے مخالف سمت جائیں گے۔

یہ ہے صحیح مفہوم مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا کا۔ اب دیکھئے کہ ان الفاظ کے لغوی معنی کس طرح اس مفہوم کے آئینہ دار بنتے ہیں۔

نسخ کے معنی ہم نے اوپر دیکھ ہی لئے ہیں۔ کسی چیز کی جگہ کسی دوسری چیز کو لے آنا۔ آیت کے معنی صرف قرآن کریم کی آیات نہیں۔ قرآن کریم نے ہر رسول کی وحی کو آیات اللہ کہا ہے۔ مثلاً اسی سورۃ بقرہ میں قصۂ آدم میں ہے کہ آدم سے کہا گیا۔ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (2:38)۔ جب بھی میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو جو کوئی اس ہدایت کی اتباع کرے گا اسے کوئی خوف اور حزن نہیں ہوگا اور اس سے آگے ہے۔ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ..... (2:39) ان کے برعکس، جو لوگ ہماری آیات کی تکذیب کریں گے اور ان سے انکار کریں گے..... یہاں سے ظاہر ہے کہ جہاں اور جب بھی خدا کی طرف سے ہدایت آئی ہے اسے آیات اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ میں آیات سے مراد قرآن کریم کی آیات نہیں بلکہ اس سے مراد ہے کسی سابق وحی کی آیات کی تبدیلی بعد کی وحی کی آیات سے۔ جیسا کہ سورۃ نحل میں کہا گیا ہے۔ وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَكَانَ آيَةٍ (16:101)۔ ''اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدل دیتے ہیں''۔

اس کے بعد لفظ نُنْسِهَا ہے۔ یہ لفظ نسی سے ہے۔ نسی کے معنی کسی چیز کو ترک کر دینا' یا فراموش کر دینا' آتے ہیں۔ (دیکھئے عنوان ن۔س۔ی)۔ اس لفظ میں یہ ساری حقیقت آ جاتی ہے کہ سابقہ کتب آسمانی اپنی اصل حالت میں باقی نہیں رہتی تھیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ جو رسول بھی آیا اس کے ساتھ یہی ہوا کہ اس کی وحی میں سرکش اور مفسد لوگوں نے اپنی طرف سے کچھ ملا دیا۔ لیکن خدا کی طرف سے ایسا ہوتا رہا کہ ان کی اس آمیزش اور ملاوٹ کو الگ کر دیا جاتا اور اس طرح اللہ اپنی آیات کو از سر نو محکم کر دیتا (22:52)۔ یا وہ اس وحی کے کچھ حصے کو ترک ہی کر دیتے تھے۔ اس حصہ کو خدا نئے رسول کی وحی میں پھر شامل کر دیتا۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ ایک آیت کی جگہ دوسری آیت (یا اس کی مثل اس جیسی آیت) سے مراد سابق وحی کی آیات ہیں نہ کہ قرآن کریم کی ایک آیت کی جگہ دوسری آیت۔

نسی کے معنی کسی چیز کو علیٰ حالہٖ چھوڑ دینے کے بھی ہیں۔ اس اعتبار سے آیت نُنْسِهَا سے مفہوم یہ ہوگا کہ جن سابقہ احکام کے متعلق ہمارا فیصلہ یہ ہوتا کہ انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے' انہیں ہم نئے رسول کی وحی میں اسی طرح شامل کر دیتے۔

اس اعتبار سے قرآن کریم ایک طرف تمام انبیاء سابقہ کی وحی کا مھیمن ہے (5:48)۔ یعنی اس کے اندر وہ تمام قوانین محفوظ ہو گئے ہیں اور دوسری طرف خدا کو جس قدر احکام نوع انسانی کے لئے دینے تھے' ان سب کی تکمیل ہو گئی ہے۔ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا (6:116)۔ نہ خدا کی طرف سے اب کسی تبدیلی کی ضرورت باقی ہے اور نہ انسانوں میں سے کوئی اس میں ردوبدل کر سکے گا۔ کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے (15:9)۔

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ خدا نے وحی کے سلسلہ کو اس طرح کیوں رکھا۔ تو اس کا جواب یہ کہہ کر دے دیا کہ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (2:106)۔ خدا کے ہاں ہر بات کے اندازے مقرر ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ انسانوں کو کس زمانے میں کس قسم کے احکام ملنے چاہئیں اور وہ دور کب آئے گا جب انہیں مکمل ضابطۂ حیات دے دیا جائے۔ یہ سب کچھ ان اندازوں کے مطابق ہوتا ہے جن پر اسے پوری پوری مقدرت حاصل ہے۔

یہ ہے ناسخ و منسوخ کا صحیح مفہوم۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس میں ایک لفظ بھی منسوخ نہیں۔ اس کا ہر حکم اپنی جگہ محکم و غیر متبدل ہے۔ البتہ ہر حکم خاص حالات کے ماتحت نفاذ پذیر ہوتا ہے۔ جب حالات بدل جائیں تو اس کی جگہ قرآن کا دوسرا حکم نافذ ہو جاتا ہے۔ مثلاً صلوٰۃ کے لئے وضو کا حکم ہے۔ لیکن اگر پانی نہ ملے یا انسان مریض ہو تو وضو کی جگہ تیمّم کا حکم ہے (5:6)۔ ان حالات میں وضو کا حکم پیچھے ہٹ جائے گا اور تیمّم کا حکم آگے آ جائے گا۔ جب پانی مل جائے گا (یا مرض جاتا رہے گا) تو پھر وضو کا حکم آگے آ جائے گا اور تیمّم کا حکم پیچھے چلا جائے گا۔

یا مثلاً قرآن کریم نے چور اور زانی (وغیرہ) کے لئے سزا مقرر کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی معاشرہ میں چوری اور زنا کی وارداتیں نہ ہوں تو قرآن کریم کے (سزاؤں کے متعلق) احکام نافذ العمل نہیں ہوں گے۔ یا مثلاً اگر کسی معاشرہ میں مفلس محتاج، گداگر نہ رہیں تو خیرات وغیرہ سے متعلق احکام نافذ نہیں ہوں گے۔ یا مثلاً اگر کوئی شخص ترکہ چھوڑ کر نہ مرے تو وراثت کے احکام اس پر نافذ نہیں ہوں گے۔ اسی طرح اگر کوئی ایسا معاشرہ متشکل ہو جائے جس میں فالتو دولت یا جائداد کسی کے پاس نہ ہو تو وراثت کے احکام نافذ نہیں ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ان امور کو ''ناسخ و منسوخ'' سے کچھ واسطہ نہیں۔ یہ احکام اپنی جگہ موجود رہتے ہیں۔ جب وہ حالات پھر پیدا ہو جائیں جن کے ماتحت انہیں نافذ ہونا تھا، تو وہ پھر نافذ ہو جاتے ہیں۔ ''منسوخ'' اسے کہتے ہیں جو ہمیشہ کے لئے ساقط ہو جائے اور کبھی نافذ نہ ہو سکے۔ قرآن کریم میں ایسا کوئی حکم نہیں۔

مَا نَنْسَخْ والی آیت (2:106)۔ یا سورۃ النحل کی آیت اِذَا بَدَّلْنَآ اٰیَۃً مَّکَانَ اٰیَۃٍ (16:101) میں اگر آیۃ سے مراد کائناتی حوادث و وقائع لئے جائیں (جنہیں قرآن کریم متعدد مقامات پر ''آیات اللہ'' کہہ کر پکارتا ہے) تو ''نسخ آیت'' سے مراد ہوگا نظام کائنات کے کسی ایک طریق یا مظہر کی جگہ کسی دوسرے طریق یا مظہر کا آ جانا۔ ارباب علم و تحقیق سے پوشیدہ نہیں کہ کائنات میں اس قسم کے تبدلات کس طرح آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔

لیکن چونکہ ہر دو مذکورہ بالا آیات کے سیاق و سباق کا تعلق وحی سے ہے اس لئے ہم پہلے بیان کردہ مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ دوسرے مفہوم کی رو سے معانی میں بڑی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

اول الذکر مفہوم ہو یا ثانی الذکر، یہ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے کہ قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں جو منسوخ ہو۔ اس غیر متبدل صحیفۂ آسمانی کا ایک ایک حرف اپنے مقام پر اٹل ہے اور اٹل رہے گا۔ واللہ علیٰ ما نقول شھید۔

☆.....☆.....☆

ملک منظور حسین لیل۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

قسط پنجم

پرویز صاحب کا نظریہء حدیث وسُنّت

روایات سے متعلق عقائد:۔ حدیث کے بارے میں مروجہ عقائد کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔ **(۱)**:۔ دین کا (۹/۱۰) حصہ احادیث میں ہے جبکہ صرف (۱/۱۰) حصہ قرآن میں ہے۔ **(۲)**:۔ حدیث بھی وحی ہے۔ حدیث اور قرآن دونوں خدا کی طرف سے نازل ہوئے ہیں۔ حدیث کا مقام وہی ہے جو قرآنِ عزیز کا ہے۔ **(۳)**:۔ حدیث قرآن کے ساتھ اس کی مثل ہے (مثلہٗ معہٗ)۔ **(۴)**:۔ حدیث قرآن کی اتنی محتاج نہیں، جتنا قرآن حدیث کا محتاج ہے۔ اور حدیث قرآن پر قاضی ہے، قرآن حدیث پر قاضی نہیں۔ اس طرح حدیث قرآن سے اونچی قرار پاتی ہے۔ **(۵)**:۔ یہ قرآن کی مفسّر اور شارح نہیں بلکہ دین کے احکام میں مستقل حیثیت رکھتی ہے (یعنی یہ مستقل دین ہے)۔ **(۶)**:۔ قرآن حکیم کے حکم ''اطیعوالرسول'' (رسول اللہ ﷺ کی اطاعت) سے مراد انہی احادیث کی اطاعت (احادیث پر عمل) ہے۔ **(۷)**:۔ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ مولانا محمد اسماعیل مرحوم (سابق صدر جمعیت اہل حدیث) نے ''جماعت اسلامی کا نظریہء حدیث'' میں لکھا ہے کہ اگر قرآن کا کوئی حکم احادیث کے خلاف جائے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن کا وہ حکم منسوخ ہو چکا ہے کیونکہ حدیث قرآن کی تفسیر ہے۔ عین ممکن ہے کہ ہمیں قرآن کی متعلقہ زیرِ غور آیت یا حکم کی سمجھ نہ آئی ہو، لہٰذا ہمیں حدیث کو حرفِ آخر مان کر قرآنی حکم کو منسوخ سمجھنا چاہیئے۔ (جو شخص احادیث کے بارے میں ایسا عقیدہ نہ رکھے وہ منکرِ حدیث فلہٰذا، کافر اور دائرہء اسلام سے خارج ہے)۔ عقیدہء ناسخ ومنسوخ پر لکھتے ہوئے پرویز صاحب اپنی عظیم تصنیف ''شاہکارِ رسالت'' کے آخری باب میں کہتے ہیں۔ ''جو قرآن (منسوخ ہونے سے) بچ گیا ہے، اسے سمجھا کس طرح جائے۔'' ''ہم دیکھ چکے ہیں کہ **''محدث''** کے عقیدہ کی رُو سے کہا یہ گیا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم کی وحی رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی تھی اور دوسری قسم کی وحی ائمہ پر۔ ان کے صرف طریقِ تنزیل میں فرق تھا۔ وحی ہونے کی جہت سے ان میں کسی قسم کا فرق نہیں تھا۔ یہ عقیدہ شیعہ حضرات کا تھا۔

وحی کی اقسام:۔ سُنیوں کے ہاں یہ عقیدہ رائج کیا گیا کہ وحی کی دو قسمیں ضرور ہیں لیکن یہ دونوں رسول اللہ ﷺ پر ہی نازل ہوئی تھیں۔ ایک کو وحیء جلی (یا وحیء متلو) کہا جاتا ہے اور دوسری کو وحیء خفی (یا وحیء غیر متلو)۔ وحیء جلی (یا متلو) قرآن مجید کے اندر ہے اور

وحی ءخفی احادیث کے اندر۔ وحی ءغیر متلو کے متعلق یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ یہ بھی ''مثلہٗ معہٗ'' قرآن کے ساتھ اس کی مثل ہے۔ چنانچہ حضرت مقداد بن معدی کرب کی روایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ:۔

مثلہٗ معہٗ:۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یاد رکھو کہ مجھے ''الکتاب'' دی گئی ہے اور اس کے ساتھ اس کی مثل کچھ اور (اِنی اوتیت الکتاب ومثلہٗ معہٗ)۔ یاد رکھو! عنقریب ایک شخص جس کا پیٹ بھرا ہوگا، اپنے تخت پر بیٹھا کہے گا کہ تم اس قرآن کو لازم پکڑو۔ جو کچھ اس میں حلال پاؤ اسے حلال سمجھو اور جو کچھ اس میں حرام پاؤ اسے حرام سمجھو۔ (ابو بکر خطیب بغدادی۔ کتاب الکفایہ)۔ یہ ''مثلہٗ معہٗ'' احادیث ہیں۔'' پرویز صاحب نے اپنی کتابِ سیرت حضور کریم ﷺ ''معراجِ انسانیت'' میں ''ختمِ نبوت'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ:۔ ''کشف والہام کے عقیدہ کی طرح ایک اور عقیدہ بھی ''اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا'' ہے۔ اور وہ عقیدہ یہ ہے کہ وحی ءنبوت کی بھی دو قسمیں ہیں۔ **ایک وحی ءِ متلو اور دوسری وحی ءغیر متلو۔ وحی ءمتلو وہ تھی جو:۔ (۱):۔** خدا کی طرف سے الفاظ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کو عطا ہوئی تھی۔ **(۲):۔** وہ وحی، بالفاظ قرآن میں محفوظ ہے۔ اور **(۳):۔** اس وحی کی تلاوت ہر جگہ ہوتی ہے۔ **اور وحی ءغیر متلو وہ تھی (۱):۔** جس کا تصور (بلا الفاظ) خدا کی طرف سے ملتا تھا اور پھر رسول اللہ ﷺ اسے اپنے الفاظ میں بیان فرماتے تھے۔ **(۲):۔** یہ وحی، کتبِ احادیث میں لوگوں نے اپنے طور پر جمع کی ہے۔ **(۳):۔** قرآن کی طرح اس کا حرفاً حرفاً من جانب اللہ ماننا ضروری ہے۔'' وحی ءمتلو (قرآن) کی تلاوت کی جاتی ہے، جبکہ وحی ءغیر متلو کی تلاوت نہیں کی جاتی۔

متلو اور غیر متلو وحی:۔ وحی متلو اور غیر متلو کے بارے میں پرویز صاحب اپنی کتاب ''معراجِ انسانیت'' میں مزید رقمطراز ہیں:۔ ''قرآن کریم میں وحی کی ان دو قسموں کا کوئی ذکر نہیں (حتیٰ کہ کتبِ احادیث میں بھی ان اصطلاحات۔ متلو اور غیر متلو۔ کا کہیں ذکر نہیں ملتا) یہ عقیدہ یہودیوں کے ہاں مروج تھا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ شب کتب، وحی متلو۔ اور شب علفہ، وحی غیر متلو۔ اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہی قابلِ غور ہے کہ یہ عقیدہ کہ خدا کی طرف سے نبی کو کوئی تصور بلا الفاظ ملتا تھا اور اسے نبی پھر اپنے الفاظ میں بیان کرتا تھا، علم النفس والالسنہ کے خلاف ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ انسان کے ذہن میں کوئی تصور (Concept) بلا لفظ (word) کے آسکے۔ تصور اور لفظ، لازم وملزوم ہیں۔ کیا آپ نے اس پر غور نہیں کیا کہ جب قرآن نے کہا کہ **نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ○ عَلٰى قَلْبِكَ** (26:193-194) اسے روح الامین نے تیرے قلب پر نازل کیا۔ تو اس کے ساتھ ہی تصریح کر دی کہ **بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ** (26:196) ''واضح عربی زبان میں'' یعنی وحی کا القا ہمیشہ (عربی زبان کے واضح) الفاظ کے ساتھ ہوتا تھا۔ الفاظ کے بغیر نہیں، ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اسی لئے وحی کو کلام اللہ (اللہ کا کلام۔ اور کلام الفاظ کے بغیر ممکن نہیں) بھی کہا گیا ہے۔ اور اس کی تلاوت کا حکم دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے ارشاد ہوا۔ **اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ** (29:45)۔ ''یہ کتاب جو تیری طرف وحی کی گئی ہے، اس کی تلاوت کر۔'' یعنی مَا اُوحِیَ (جو کچھ بھی وحی کیا گیا تھا) وہ متلو (جس کی تلاوت کی جائے) تھا۔ غیر متلو، وحی کوئی نہیں تھی۔ لہٰذا، وحی صرف قرآن کریم ہے۔'' چونکہ ''ما اُوحِیَ'' (جو کچھ وحی کیا گیا) کی تلاوت کا حکم ہے لہٰذا

غیر متلو (وحی خفی) کا تو تصور ہی ختم ہو جاتا ہے (موءلف)۔

حدیث بھی وحی ہے:۔ طلوعِ اسلام مئی۔ جون ۱۹۸۲ء۔ ص۔ ۳۱۔ ''جبریل، قرآن اور سنت، دونوں کو لے کر نازل ہوتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کو سنت بھی قرآن کی طرح سکھاتے تھے۔ اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں۔'' (جماعت اسلامی کا نظریہء حدیث از مولانا محمد اسماعیل مرحوم۔ ص۔ ۶۰)۔ جب وحی میں تفریق نہ رہی، اور قرآن اور حدیث میں مذکور وحی ایک ہی قرار پا گئی تو مولانا مسعود احمد صاحب نے بات کھل کر کہہ دی کہ:۔ ''حدیث کو کتاب اللہ کہا جاتا ہے۔'' (تفہیم اسلام۔ ایڈیشن ۱۹۶۷ء)۔

شریعت بنچ کا فیصلہ:۔ حیرت ہے کہ پاکستان کی سپریم کورٹ کے شریعت بنچ نے قانونِ شفعہ کو اسلام کے معیار پر پرکھتے ہوئے ''سنت'' کو ''وحی کی ایک صورت'' قرار دیا (PLD 1986 SC 360-431-DD)۔ اس کی وجہ یہی نظریہ ہے کہ وحی کی دو قسمیں، وحی متلو (وحی جلی یعنی قرآن) اور وحی غیر متلو (وحی خفی یعنی سنت یا حدیث) ہیں۔ یہ نظریہ قرآن کے خلاف ہے (موءلف)۔

حدیث بطور وحی:۔ سوچنے کا مقام ہے کہ کیا آخری وحی آجانے کے بعد کسی ''وحی'' کی یہ صورت اور کیفیت بھی ہو سکتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکمِ تلاوت (۲۹/۴۵) کے باوجود ایسی ہو جس کی تلاوت نہ کی جائے، قرآن کی اصطلاح میں وحی کو کتاب (جو چیز لکھی جائے) کا درجہ حاصل ہے مگر جس وحی (غیر متلو) کو کتاب کا درجہ حاصل نہ ہو اور اسے وحیء غیر مکتوب (جسے نہ لکھا گیا ہو) کہا جائے، جسے صاحبِ وحی ﷺ کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے ڈیڑھ دو سو سال بعد صرف زبانی روایات کی بناء پر جمع و مدون کیا گیا ہو، اکابر جامعینِ حدیث تقریباً تمام کے تمام غیر عرب ہوں، جس وحی کے ایک ہی بات یا واقعہ کے متعلق مختلف راویان ہوں اور اُن کی متعدد روایات کے الفاظ اور انداز ایک دوسرے سے مختلف بلکہ بعض اوقات باہم دگر متضاد ہوں، جسے صحیح ثابت کئے جانے کی ضرورت ہو (اور اسی لئے) جو علومِ اسماء الرجال اور جرح و تعدیل (یعنی انسانی علم، کردار، حافظہ اور نیت وغیرہ) کی محتاج ہو (حدیث کو جرح و تعدیل اور صحیح اور غلط کی کسوٹی پر چڑھانا ہی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ حدیث وحی کی کوئی صورت یا قسم نہیں)، جس وحی کی (انسانوں کی اپنی وضع کردہ) مختلف اقسام (صحیح، حسن، قوی، ضعیف، منقطع، متواتر حتیٰ کہ ''موضوع'' وغیرہ) ہوں اور جس کی حفاظت بھی نہ کی گئی ہو وغیرہ وغیرہ۔۔۔ وحی (قرآن کریم) کی نہ یہ صورت ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔۔ یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ اگر حدیث کو بھی ''وحی'' مان لیا جائے تو حضور کریم ﷺ کی اپنی شخصیت کے بارے میں کیا تصور ابھرتا ہے کہ اگر حضور کریم ﷺ کو ہر بات میں وحی کے ذریعے ہدایات ملتی تھیں تو اُن ﷺ کی اپنی شخصیت کی حیثیت کیا تھی؟۔ (موءلف)۔

حضور کریم ﷺ کی شخصیت کی اہمیت:۔ قرآن کریم نے حضور کریم ﷺ کی مختلف حیثیتیں بیان کی ہیں۔ معلم، مزکی، سپاہ سالار، قاضی، فرماں روا وغیرہ تو کیا ان حیثیتوں پر عمل کرنے کے لئے حضور کریم ﷺ پر وحی متلو (قرآن) کے ساتھ وحی غیر متلو (خفیہ ہدایات و احکامات وغیرہ یعنی حدیث و سنت) بھی نازل ہوتی تھی؟۔ اگر ہر صورت اور ہر حیثیت میں آپ کو وحی (غیر متلو) کنٹرول کرتی

تھی اور آپ وحی (غیر متلو) کے نزول سے پہلے یا وحی کے نزول کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتے تھے تو پھر حضور کریم ﷺ کی ذاتی ذہانت و فطانت، فہم و فراست، تدبیر و تدبر، قوتِ ارادی و خود اعتمادی اور قوتِ فیصلہ وغیرہ کی کیا اہمیت و حیثیت رہ جاتی ہے؟۔۔اور پھر حضور کریم ﷺ کی فتح و شکست (غزواتِ بدر، احد و حنین وغیرہ) کے کیا معنی نکلتے ہیں؟۔اگر حضور کریم ﷺ اپنے سارے ذاتی، عوامی یا حکومتی فرائض وحی (غیر متلو) کے تحت سرانجام دیتے تھے اور اپنی طرف سے کچھ بھی کرنے کے مجاز نہ تھے تو پھر آپ ﷺ کی اپنی ذاتی حیثیت کیا ہے؟۔پھر ہم جو سیرت پاک (ﷺ) کی کتب لکھ لکھ کر حضور کریم ﷺ کی زندگی کے مختلف گوشوں کو فخر سے سامنے لاتے رہتے ہیں اور ان ﷺ کی جنگی، حکومتی، انتظامی، سیاسی، معاشی اور اعلیٰ ترین انسانی بصیرت اور بے مثال حکمتِ عملیوں وغیرہ کے تذکرے کرتے رہتے ہیں، ان کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے؟۔کیونکہ اس طرح تو آپ ﷺ جو کچھ بھی کرتے تھے بلا واسطہ خدائی احکامات (وحی غیر متلو) کے تحت کرتے تھے۔اس میں کمال حضور کریم ﷺ کی اپنی شخصیتِ کامل کا نہیں بلکہ خدائی کنٹرول کا نظر آتا ہے۔اس طرح تو اگر خدا چاہتا تو محمد (ﷺ) بن عبداللہ کی بجائے کسی بھی اور شخص کو ہمہ وقت اپنے کنٹرول میں رکھ کر آخری نبوت کا کام لے سکتا تھا۔اس مقصد کی خاطر نبی کے لئے کسی خاص انسانی سطح کی شخصیت، ذہن اور دل و دماغ کی ضرورت نہیں تھی۔نہ ہی اسے کسی خاص انتخاب (اور وقت۔چالیس سال) کی ضرورت تھی۔خدا جسے چاہتا اسے فوراً انسانِ کامل کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کر دیتا۔ظاہر ہے کہ محمد رسول اللہ (ﷺ) کے ساتھ ساتھ ان (ﷺ) کی ذاتی شخصیت کی بھی ایک خاص حیثیت، اہمیت اور عظمت ہے (موءلف)۔

رسول کریم ﷺ کی بشریت:۔یہ بشریتِ انبیاء کیا ہے؟۔حضور کریم ﷺ یا کسی بھی نبی کو ماورائے بشریت تسلیم کرنا خلافِ قرآن ہے۔نبی ایک بشر ہوتا ہے۔افضل البشر یعنی بلحاظ درجہ اعلیٰ وارفع بشر نہ کہ مافوق الانسان ہستی۔یعنی عام انسانوں سے بلحاظ درجہ نہ کہ بلحاظ قسم مختلف۔البتہ وحی کے نزول کا فرق ایک نبی اور غیر نبی میں مخصوص امتیاز پیدا کر دیتا ہے۔نبی ایک ایسا بشر ہوتا ہے جو جامعِ کمالات، مستجمع الصفات، تمام اعلیٰ ترین انسانی صلاحیتوں کا مالک اور ہر لحاظ سے اکمل و افضل ہوتا ہے۔گو نبی کو اپنی نبوت کے ملنے سے ایک لمحہ قبل تک بھی اپنی نبوت کا علم نہیں ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ اپنے منصوبے کے تحت، بننے والے نبی کی اعلیٰ اور شایانِ نبوت تربیت کا بندوبست پہلے سے کرتا ہے اور اس کی شخصیت میں اعلیٰ ترین بشری اوصاف مثل فراست، بصیرت، جراءت وغیرہ مکمل طور پر بھر دیتا ہے تاکہ وہ وحی کو وصول کرنے کے قابل بن سکے۔اور پھر وحی کو بہترین طور پر سمجھ کر اس پر بہترین طور پر عمل کر کے دنیا کے سامنے بہترین نمونہ پیش کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نظریہ غلط ہے کہ قرآن کریم پر صرف حضور کریم ﷺ جیسی ہستی ہی عمل پیرا ہو سکتی ہے اور آج کے انسانوں کے لئے ایسا کرنا ممکن نہیں۔چونکہ حضور ﷺ ایک (اعلیٰ ترین قسم کے) انسان تھے، انہوں نے بحیثیت بشر قرآن کریم پر عمل کر کے دکھایا جس کا مطلب واضح طور پر یہی ہے کہ دوسرے انسانوں کے لئے بھی قرآن کریم پر عمل کرنا ممکن ہے۔اگر یہ مان لیا جائے کہ قرآن کے علاوہ وحی غیر متلو یا وحی خفی بھی حضور کریم ﷺ کے ضبط و ہدایت کے لئے نازل ہوتی تھی تو اس طرح

حضور کریم ﷺ ایک ایسی مافوق البشر ہستی قرار پا جاتے ہیں جن کی پیروی کرنا ہمارے لئے ناممکن ہے کیونکہ اس طرح حضور کریم ﷺ (مثلکم کی بجائے) بشریت کی کسی الگ قسم میں شمار ہونے لگتے ہیں۔ ہم، جناب پیغمبر ﷺ کی ذاتی حیثیت میں (جس میں ان (ﷺ) کی شخصیتِ کامل کا وجود ناقابلِ انکار ہے) وحی خفی کا کردار شامل کر کے اور یوں ان (ﷺ) کی تمام اعلیٰ وارفع ترین بشری صلاحیتوں کا انکار کر کے، انہیں ایک معجزاتی، طلسماتی اور مافوق البشر ہستی بنا دیتے ہیں (موءلف)۔

انسانِ کامل:۔ جہاں تک حضور کریم ﷺ کی ذاتی حیثیت یا مختلف حیثیتوں کا سوال ہے یا ''وما ینطق عن الھویٰ۔۔۔'' وغیرہ کا تعلق ہے تو ان کا مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ کی اپنی شخصیت اس قدر فہم وفراست اور جراءت وبصیرت کی مالک تھی کہ آپ ﷺ بطور اشرف و اکمل انسان، وحی منزل من اللہ (قرآن کریم) پر عمل پیرا ہونے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ اور آپ ﷺ اپنی فطانتِ عظمیٰ اور وحی پر مکمل طور پر عمل کرنے کی قوت، طاقت، جراءت، وسعت اور صلاحیت کے سبب انسان کامل کہلانے کے مستحق ہیں۔

آپ ﷺ کی ذات اور شخصیت میں اس قدر فہم وفراست اور بصیرت تھی کہ آپ ﷺ وحی کے مفہوم ومنشاء کو مکمل طور پر سمجھ جاتے تھے اور پھر وحی کو بعینہٖ لوگوں تک پہنچا کر وحی کے حقیقی مفہوم ومنشاء پر پوری طرح عمل کر کے لوگوں کے سامنے عملی نمونہ پیش کرتے تھے۔ خدائے پاک نے ساری قوتیں، صلاحیتیں اور عظمتیں آپ ﷺ کی شخصیت میں جمع کر کے آپ ﷺ کی شخصیت کو مکمل طور پر بالیدگی ونشوونما عطا فرما دی۔ اسی لئے آپ ﷺ انسانی شخصیت کا اکمل ترین نمونہ ہیں کیونکہ آپ ﷺ وحی پر مکمل طور پر عمل کر کے دکھا دیتے تھے۔ اور یہ کہنا کہ وحی (قرآن) کے ساتھ اس کی تشریح وتفسیر اور عمل کرنے کے لئے ہدایات بھی براہِ راست اللہ کی طرف سے وحی خفی (غیر متلو یا غیر مکتوب) یعنی حدیث وسنت کی صورت میں نازل ہوتی تھیں، درست نہیں کیونکہ اس سے حضور کریم ﷺ کی اپنی ذاتِ اقدس واعظم اور شخصیتِ کامل کی نفی ہوتی ہے۔ اور وحی کے بغیر بات تک نہ کرنے کا مفہوم یہی ہے کہ آپ ﷺ ہمیشہ قرآن کی حدود میں رہتے تھے اور شدت سے وحی کی اتباع واطاعت کرتے تھے۔ چونکہ آپ ﷺ میں وحی کی مکمل طور پر اطاعت کرنے کی صلاحیت، اور سخت مخالف قوتوں کے دباؤ کے باوجود وحی پر عمل کر کے دکھا دینے کی پوری پوری جراءت موجود تھی لہٰذا، آپ ﷺ سے وحی کی خلاف ورزی کے ذرہ بھر امکان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ ایک غیر نبی میں بہت سی صلاحیتوں اور جراءتوں کے باوجود وحی کو پوری طرح نہ سمجھ پانے اور عملاً وحی کی خلاف ورزی کرنے کے زبردست امکانات موجود ہوتے ہیں۔ اسی لئے کسی دوسرے انسان کو انسانِ کامل کا درجہ حاصل نہیں (موءلف)۔

وحی خفی اور حکمِ مشاورت:۔ مختلف فرائض کی بجا آوری کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے حضور کریم ﷺ کو اپنے دوستوں سے مشورہ کرنے کا حکم دیا۔ آخر یہ مشورہ کرنے کا حکم کس مقصد اور ضرورت کے تحت ہے؟۔ جبکہ وحی غیر متلو سارے مقاصد پورے کرتی اور ہر قسم کی مشکلات کا حل پیش کرتی ہے۔ ''ہمارے ہاں یہ عقیدہ بھی ہے کہ وحی قرآن ہی نہیں، حضور ﷺ کا ہر ارشاد وعمل بھی وحی پر مبنی ہوتا تھا۔ اسے وحی خفی کہا جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضور ﷺ کا ہر فیصلہ وحی پر مبنی ہوتا تھا تو آپ ﷺ کو صحابہؓ کے ساتھ مشورہ کا

حکم کیوں دیا گیا۔ جو فیصلہ وحی پر مبنی ہو اس کے لئے مشورہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' (طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۸۳ء۔ص۔۸)۔

وحی خفی اور علمِ غیب:۔ اگر وحی خفی کے عقیدے کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ حضور کریم ﷺ عالم الغیب بھی تھے کیونکہ وحی خفی علمِ غیب سے تعلق رکھتی ہے۔ بریلوی حضرات علمِ غیب کی جو تشریح کرتے ہیں وہ عقیدہء وحی ءخفی کے رکھنے سے انہی (بریلوی فرقہ) کے حق میں جاتی ہے۔ بریلوی حضرات بھی حضور کریم ﷺ کو اللہ کے وجود کا حصہ اور حضور کریم ﷺ کے علمِ غیب کو اللہ کے علمِ غیب کی طرح کا علمِ غیب نہیں سمجھتے۔ بلکہ وہ کہتے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضور کریم ﷺ کو قرآن کے علاوہ بھی باقی تمام باتوں کی خفیہ خبر دے رکھی تھی جسے وہ حضور کریم ﷺ کا علمِ غیب کہتے ہیں اور وحی خفی کا مطلب بھی ایسی ہی وحی لیا جاتا ہے جو قرآن کے علاوہ کئی امور بتانے کے لئے خفیہ طور پر حضور کریم ﷺ پر نازل ہوتی تھی۔ جبکہ غیر بریلوی حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ حضور کریم ﷺ کو جو علمِ غیب ملتا تھا وہ صرف وحی کے ذریعے ملتا تھا یعنی صرف وحی ہی وہ علمِ غیب تھی جو حضور کریم ﷺ کو دوسرے انسانوں سے ممتاز کرتی تھی۔ اس وحی (قرآن کریم) کے علاوہ کوئی اور علمِ غیب نہیں تھا جس کے آپ ﷺ مالک ہوتے (موءلف)۔

وحی خفی کی مثالیں:۔ مولانا مودودی مرحوم نے اپنی کتاب ''سنت کی آئینی حیثیت'' میں صفحات نمبر ۲۵۔۱۱۸ پر وحی خفی کی کچھ مثالیں دی ہیں لیکن ہم جب دیکھتے ہیں کہ حضور کریم ﷺ کو کچھ معاملات میں مشکلات بھی پیش آئیں (مثلاً غزوہء احد و حنین وغیرہ اور غزوہء تبوک کہ افواہ کے پیشِ نظر آپ ﷺ تبوک تشریف لے گئے تھے، حالانکہ وحی خفی کے ذریعے خبردار کر کے آپ ﷺ کو ان مصائب سے بچایا جا سکتا تھا۔ چونکہ جن واقعات کے حوالے وحی خفی کے جواز کے سلسلے میں دیئے گئے ہیں، ان میں سے بعض مذکورہ جنگوں سے بھی کم اہمیت کے واقعات ہیں) تو وحی خفی کے غیر قرآنی عقیدے سے ایمان مزید اٹھ جاتا ہے۔۔ جو وحی (قرآن) چھوٹی چھوٹی لغزشوں (مثلاً شہد کا نہ کھانا، کسی کیلئے دعائے مغفرت نہ کرنا وغیرہ) پر تنبیہ کر سکتی ہے وہ وحی اہم ترین معاملات (مثلاً حضور کریم ﷺ کے مشورے کے خلاف غزوہء احد میں صحابہ کرامؓ کا باہر جا کر لڑنا اور شکست کھانا یا نماز کے اوقات و رکعت اور طریق ادائیگی وغیرہ) کے سلسلے میں بھی چند الفاظ کا اضافہ کر کے ان معاملات کو نمٹا سکتی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ پر وحی خفی وغیرہ قسم کی کوئی وحی نازل نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ وحی (قرآن) ہی کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے احکامِ الٰہی پر نہایت کامیابی سے عمل پیرا ہونے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ اور اگر کہیں اس عمل پیرائی میں ان ﷺ سے ذرا سی بھی لغزش ہونے لگتی تو وحی (قرآن) کے ذریعے انہیں ﷺ تنبیہ کر دی جاتی تھی (۸۰/۱ وغیرہ) ورنہ (وحی خفی کو ماننے کی صورت میں تو) تنبیہ بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے کیونکہ جب حضور ﷺ اپنی مرضی اور بصیرت کے تحت کچھ کر ہی نہیں رہے ہوتے تھے تو پھر تنبیہ کی کیا ضرورت رہ جاتی تھی یا وحی (قرآن) کی صورت میں تنبیہ کی کیا ضرورت ہوتی تھی؟۔ ایک عام بشر اور ایک نبی میں یہی امتیاز نظر آتا ہے کہ ایک نبی میں اس قدر بصیرت رکھ دی جاتی ہے اور اس کی تربیت ایک الوہی منصوبے کے تحت شروع ہی سے اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ بشریت کے باوجود

وحی کے مطابق اکمل ترین عملی نمونہ بن کر دکھانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے اور جہاں کہیں اس سے لغزش ہونے لگتی ہے، اسے تنبیہ کر دی جاتی ہے تا کہ ایک نبی معصوم عن الخطا ہونے کے مقام پر فائز رہے (موءلف)۔

محدثینِ کرامؒ نے احادیث کی بلحاظ درجہ بہت سی اقسام بیان کی ہیں جن میں ضعیف (کمزور)، غریب اور موضوع وغیرہ احادیث بھی شامل ہیں۔ احادیث کے معتقد حضرات ایسی احادیث کو قرآن کریم پر پرکھ کر ان کا انکار تو نہیں کر سکتے، البتہ اسماء الرجال کے مطابق انہیں ''غریب یا کمزور'' وغیرہ کا درجہ دے کر تسلیم کر لیتے ہیں۔ اگر احادیث کو (خفی، غیر متلو یا غیر مکتوب) وحی مانا جائے تو اس کا مطلب ہوگا کہ وحی ''غریب اور کمزور'' بھی ہوتی ہے۔ یاللعجب!۔ وحی کی متعدد اقسام بلحاظ درجہ (کمزور یا غریب وغیرہ) کا ہونا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ حدیث وحی (کی کوئی قسم) نہیں کیونکہ وحی غریب، کمزور، موضوع یا غیر صحیح وغیرہ نہیں ہوسکتی۔ وحی ہمیشہ ''صحیح'' ہوتی ہے۔ صرف قرآن کریم ہی وحی ہے۔ وحی کی ایک ہی قسم ہے جو قرآنِ کریم کی صورت میں محفوظ ہے۔ (۶:۱۹۔ ۱۸:۲۷۔ ۴۲:۷۔ ۲۹:۴۵۔ ۱۲:۳۔ ۱۳:۳۰) اور جس کی تلاوت کا حکم ہے (موءلف)۔

☆.....☆.....☆

مثلہٗ معہٗ (وحی خفی کے عقیدے کی داستان):۔ طلوعِ اسلام اپریل ۱۹۸۳ء۔ ص۔ ۹۔ ۵:۔ ''یہ (اسلام کا) نظام اس وقت تک قائم رہا جب تک ''خلافت'' قائم رہی۔ اس کے بعد جب امت پر ملوکیت مسلط ہوگئی تو اسلام کی گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی۔ ملوکیت کے معنی ہوتے ہیں بزورِ شمشیر اقتدار پر قابو پالینا۔ اس کے بعد یہ اقتدار (ذاتی جائیداد کی طرح) موروثی بھی ہو جاتا ہے۔ یہ نظام قرآن کے یکسر خلاف تھا۔ ظاہر ہے کہ جب مملکت کی بنیاد ہی خلافِ قرآن تھی تو اس میں قرآنی قوانین کے نفاذ کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا تھا۔ حصولِ اقتدار کا قرآنی طریق مملکت کے اسلامی ہونے کی بنیادی شرط ہے۔ ملوکیت کو اسی لئے خلافِ اسلام کہا جاتا ہے کہ اس میں اقتدار قرآنی طریق کے مطابق حاصل نہیں کیا جاتا۔ لیکن ان سلاطین کی مشکل یہ تھی کہ رعایا بہر حال مسلمان تھی جسے مطمئن رکھنا ضروری تھا کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے، وہ اسلام کے خلاف نہیں۔ سوچئے کہ یہ کس قدر مشکل مرحلہ تھا۔ لیکن انہوں نے اس مشکل کا حل دریافت کر لیا۔ (انہوں نے خود یہ حل تلاش کر لیا یا ان کے حاشیہ نشینوں نے انہیں یہ سُجھا دیا!۔) اس کے لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کو صرف قرآن نہیں ملا تھا۔

ملوکیت کی کارستانی:۔ مثلہٗ معہٗ۔ قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل کچھ اور بھی ملا تھا۔ ہم حیران ہوتے ہیں کہ جنہوں نے یہ عقیدہ وضع کیا تھا ان کے حوصلے کس قدر دراز اور جراءتیں کس قدر بے باک تھیں!۔ اللہ تعالےٰ نے بار بار یہ چیلنج دیا ہے کہ: وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (2:23)۔ ''جو کچھ ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے۔ اگر تمہیں اس کے منجانب اللہ ہونے پر شبہ ہو تو (پورا قرآن نہیں، اس کی) ایک سورۃ کے مثل بنا کر دکھاؤ۔ اس کے

لئے جنہیں بھی تم اپنے ساتھ ملانا چاہتے ہو، ملا لو۔'': فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ (2:24)۔ ''اگر تم ایسا نہ کر سکے۔ اور ہم دعوے سے کہے دیتے ہیں کہ تم ایسا نہیں کر سکو گے۔ قطعاً نہیں کر سکو گے۔ تو پھر جہنم کے عذاب سے ڈرو''۔۔ کفار نے تو اس کی ہمت نہ کی کہ قرآن کی کسی ایک سورۃ کی مثل بنا کر دکھا دیتے لیکن خود ہم نے یہ دعویٰ کر دیا کہ قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل کچھ اور بھی ہے۔ اور قیامت بالائے قیامت کہ اسے منسوب کر دیا خود ذاتِ رسالتمآب ﷺ کی طرف۔ اس کے لئے نہ ہم خدا سے ڈرے، نہ اس کے رسول ﷺ سے نادم ہوئے!۔ اس عقیدہ کے وضع کرنے والوں پر جب یہ اعتراض کیا گیا تو انہوں نے جواب میں کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ''قرآن کی مثل'' اپنی طرف سے نہیں بنایا تھا۔ یہ بھی خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملا تھا۔ یعنی وحی کی دو قسمیں تھیں۔ ایک وحی مکتوب تھی جو قرآن کے اندر درج اور محفوظ ہو گئی۔۔ دوسری وحی لکھی نہیں گئی تھی، روایات کے ذریعے زبانی آگے چلی تھی۔۔ (ہم سمجھتے ہیں کہ جس دن یہ عقیدہ وضع ہوا، اُسی دن اسلام دوسری پٹڑی پر جا پڑا۔ پھر حقیقی اور غیر ملوث و غیر محرف اسلام باقی نہ رہا۔ طلوعِ اسلام بابت دسمبر ۱۹۵۲ء میں علامہ تمنا عمادیؒ کا ایک نہایت بلند پایہ تحقیقی مقالہ شائع ہوا تھا جس میں ثابت کیا گیا تھا کہ یہ روایت یکسر وضعی ہے)۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اس دوسری وحی کو نہ رسول اللہ ﷺ نے منضبط کر کے امت کو دیا تھا، نہ ہی خلافتِ راشدہ کے زمانے میں یہ ضبطِ تحریر میں آئی تھی۔ حتیٰ کہ جب (عباسیوں کے زمانے میں) یہ عقیدہ وضع ہوا، اُس وقت بھی یہ کسی کتاب میں منضبط نہیں تھی۔ اس مشکل کا حل یہ سوچا گیا کہ لوگ جن باتوں کے متعلق کہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات ہیں، انہیں (ان کی زبانی) جمع کر لیا جائے۔ یہ سلسلہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے قریب اڑھائی سو سال بعد شروع ہوا۔ ان میں سے جن جامعین روایات کو معتبر اور مستند تسلیم کیا جاتا ہے، انہیں کس قدر کثیر تعداد میں روایات ملیں اور انہوں نے ان میں سے کتنی روایات کو مسترد کر کے بقایا کو قابلِ قبول سمجھا، اس کا اندازہ ذیل کی تفصیل سے لگائیے''۔ (یہ تفصیل پہلے ''جمع و تدوینِ حدیث'' کے عنوان کے تحت آ گئی ہے۔ موء لف)۔ ''مندرجہ بالا وضاحت سے دو اہم نکات سامنے آتے ہیں۔ اوّل یہ کہ اُس (ابتدائی) زمانے میں بھی کس قدر ایسی روایات پھیلی ہوئی تھیں جو (خود جامعین کے معیار کے مطابق) ناقابلِ قبول تھیں۔ اور دوسرے یہ کہ جامعین نے ان میں سے اپنے قیاس کے مطابق فیصلہ کیا کہ کون کون سی روایت قابلِ قبول ہے۔ ان کے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں تھا جس سے یقینی طور پر معلوم کیا جا سکتا کہ حضور ﷺ نے فی الواقعہ ایسا فرمایا تھا۔ یہ وجہ ہے جو ایک ہی مجموعہ میں متضاد احادیث بھی ملتی ہیں اور مختلف مجموعوں میں ایک دوسرے سے متضاد بھی۔۔۔ اور یہ ہیں وہ روایات جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے وحی خفی کے ذریعے حضور ﷺ کو ملی تھیں۔ اور ان کی حیثیت ہے۔۔ قرآن کی مثل، قرآن کے ساتھ۔۔ اتنا ہی نہیں کہ یہ ''قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل'' ہیں۔ عقیدہ یہ ہے کہ یہ قرآن پر اضافہ بھی کر سکتی ہیں۔ حتیٰ کہ اسے منسوخ بھی۔ اگر قرآن اور حدیث کے کسی حکم میں تضاد ہو تو حکم حدیث کا واجب الاطاعت ہو گا۔۔۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ اس ایک عقیدہ سے ان سلاطین کے احکام اور ان کی روشِ زندگی کو اسلام کے مطابق ثابت کرنے کے لئے کتنے پھاٹک کھل گئے۔ جو بات سامنے آئی اس کے لئے ایک روایت وضع کر لی۔

ان وضعی احادیث کی کس قدر بھرمار تھی، اس کا اندازہ علامہ اسلم جیراج پوریؒ کے اس تحقیقاتی مقالہ سے لگائیے جو طلوعِ اسلام بابت ستمبر ۱۹۸۱ء میں ''وضعِ حدیث'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ وضعی روایات کا ایک سیلاب تھا جو امنڈے چلا آرہا تھا اور جن سے ہر خلافِ اسلام عقیدہ اور مسلک کے جواز کی سند مل جاتی تھی۔

فرقوں کی پیدائش:۔ جب مملکت کو قوانین کی ضرورت پڑی تو اُس زمانے کے ماہرینِ قانون نے (جنہیں فقہاء کہا جاتا ہے) قوانین مرتب کئے جو بیشتر انہی روایات پر مبنی یا ان سے مستنبط تھے۔ جس طرح روایات ایک دوسرے سے متضاد تھیں، اسی طرح ان فقہاء کے ضوابطِ قوانین بھی ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ اس طرح امت فرقوں میں بٹ گئی۔ ایک گروہ نے کہا ہم براہِ راست روایات کو اسلام سمجھتے ہیں۔ انہیں اہلِ حدیث کہا جاتا ہے۔ اور ان کے بھی کئی فرقے ہیں۔ دوسروں نے کہا کہ ہم فقہ کو اسلام تسلیم کرتے ہیں۔ فقہیں چونکہ مختلف ائمہء فقہ کی مختلف تھیں اس لئے ان میں مزید فرقے پیدا ہو گئے۔ حنفی۔ مالکی۔ حنبلی۔ شافعی وغیرہ۔ (ان کے علاوہ بے شمار اور بھی) مملکت نے یہ کیا کہ امورِ مملکت اپنی تحویل میں رکھ لئے جن میں مذہبی پیشوائیت کا عمل دخل نہیں تھا۔ اور پرسنل لاز ان مذہبی پیشواؤں کے حوالے کر دیئے کہ تم آپس میں لڑو جھگڑو۔ اس میں مملکت کا فائدہ تھا۔ ان کے باہمی جھگڑے کتنے ہی ہوں، قرآن کو سند اور حجت کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا تھا۔۔ نہ مملکت، نہ مذہبی پیشوائیت۔۔ اصل یہ ہے کہ (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) قرآن سے پیچھا چھڑانے کے لئے تو یہ سارا کھیل کھیلا گیا تھا!۔ قرآن کو سند ماننے سے سب سے پہلے خود مملکت (ملوکیت) ختم ہو جاتی، اور اس کے ساتھ مذہبی پیشوائیت بھی۔۔ ان دونوں کا مفاد اس میں تھا کہ قرآن طاقوں پر رکھا رہے اور اس کا مصرف، اس کے لفظوں کی تلاوت سے ثواب حاصل کرنا اور اسے مردوں کو پہنچانا رہ جائے۔ اس نہج سے دیکھئے تو ہم سابقہ اہلِ کتاب (بالخصوص یہود) کے مقام پر ہیں۔ وہ کتاب اللہ کے بھی قائل تھے لیکن اس کے ساتھ دوسری وحی (وحی غیر مکتوب) پر بھی ایمان رکھتے تھے (ہم نے وحی کی دو قسموں کا عقیدہ یہودیوں ہی سے مستعار لیا ہے)۔ یہ وحی روایات کی شکل میں تھی جس کا نام ''مشنا'' تھا۔ انہی روایات کی رو سے انہوں نے اپنی فقہ مرتب کی تھی جسے ''تالمود'' کہا جاتا ہے۔ اسے بھی وہ تورات کی مثل سمجھتے ہیں۔ تورات پر ان کا محض رسمی ایمان ہے۔ عمل روایات اور فقہ ہی پر ہے۔ یہی مسلک ہمارا ہے۔۔۔ اسلام کی انفرادیت یہ تھی کہ اس میں خدا کی کتاب محفوظ تھی۔ لیکن اس سے فرق کیا پڑتا ہے؟۔ کتاب اللہ کو محفوظ تو اس لئے رکھا گیا تھا کہ اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ اگر کتاب اللہ محض تلاوت کے لئے ہو اور عمل روایات اور فقہ کے مطابق تو، کتاب اللہ کا محفوظ (بلکہ موجود) ہونا یا نہ ہونا یکساں ہے۔ قرآن کریم نے یہودیوں کا (یہ کہتے ہوئے) سخت مواخذہ کیا تھا کہ تم انسانوں کے وضع کردہ احکام کو شریعتِ خداوندی قرار دیتے ہو اور لوگوں سے یہی کہہ کر اطاعت کراتے ہو اور اس باطل فروشی کو تم نے ذریعہء معاش بنا رکھا ہے۔ فویل ''للذین یکتبون الکتاب بایدیھم۔ ثم یقولون ھذا من عنداللہ لیشتروا بہ ثمناً قلیلاً (۲/۷۹)۔ سوچئے کہ کیا ہم بعینہٖ اسی مقام پر نہیں؟۔ ہم نے کتاب اللہ کو بالائے طاق رکھ کر، جامعینِ روایات کے قیاس کی رو سے منتخب کردہ احادیث کو، ارشاداتِ رسول اللہ ﷺ قرار دیا۔ پھر انہیں، قرآن کے ساتھ قرآن کے ہم پایہ (مثلہٗ معہٗ) ٹھہرایا۔ پھر ان کی

رو سے انسانوں کے مرتب کردہ قوانین کو ابدی اور غیر متبدل شریعتِ خداوندی قرار دیا اور انہی کی اطاعت کا نام ''اسلام'' رکھا۔ یہ سب ملوکیت کا ساختہ پرداختہ تھا جس کا مقصد اپنی غیر اسلامی روش کو اسلامی بنا کر دکھانا تھا۔ ملوکیت کے ختم ہو جانے کے بعد، ان اختراعات کو بھی ختم ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن ان پر ابدیت کی مہر لگانے کے لئے تقلیدِ اسلاف کو عین اسلام قرار دے دیا۔ اس سے رفتہ رفتہ یہ حالت ہو گئی کہ:۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (2:170)۔ ''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ کتاب اللہ کا اتباع کرو تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں!۔ ہم اپنے اسلاف کے مسلک ہی کا اتباع کریں گے۔'':۔ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (39:45)۔ ''جب ان کے سامنے خدائے وحدہٗ لا شریک (قرآنِ خالص) کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کا دل پیچ و تاب کھانے لگ جاتا ہے۔ لیکن جب خدا کے سوا اوروں کا ذکر کیا جائے تو ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔'' یہ اپنے معتقدین کو تاکید کرتے رہتے ہیں کہ:۔ لاتسمعوا لھذا القرآن۔ جہاں کہیں قرآن کی بات ہو تو اسے مت سنو۔ اور اس خیال سے کہ اسے دوسرے لوگ نہ سن لیں:۔ والغوا فیہ۔ خوب شور مچاؤ۔ قرآن خالص کی طرف دعوت دینے والے کے خلاف نہایت زور شور سے پراپیگنڈہ کرو۔۔ یہ منکرِ رسالت ہے۔ تین نمازوں اور نو دن کے روزوں کی تلقین کرتا ہے۔ اردو میں نماز پڑھتا ہے۔ ایک نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے کسی دن نبوت کا دعویٰ کرے گا۔ وقس علیٰ ھذا۔۔ یہ جھوٹا پراپیگنڈہ مسلسل اور متواتر کئے جاؤ۔ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (41:26)۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے تم قرآن کی آواز کو دبا سکو گے۔''

تفسیرِ قرآن بالرّ وایات:۔ ادارہ طلوعِ اسلام کی کتاب ''مقامِ حدیث'' میں قرآنِ کریم کی تفسیر روایات کی رُو سے، پر لکھا گیا ہے کہ۔ ''یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوا۔ آپ نے اسے صحابہؓ کو سمجھایا۔ لہٰذا قرآن کی جو تفسیر حضور ﷺ نے بیان فرمائی تھی، اس سے بہتر تفسیر اور کس کی ہو سکتی ہے؟۔ اس لئے اگر کوئی شخص قرآن کی کسی آیت کا مطلب اس سے مختلف لیتا ہے جو مطلب رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا تھا تو اس کا مطلب صحیح نہیں ہو سکتا۔ یہ بات بڑی معقول نظر آتی ہے۔ اس میں کسے کلام ہو سکتا ہے کہ قرآن کا جو مطلب نبی اکرم ﷺ نے بیان فرمایا وہی صحیح ہو سکتا ہے۔ اس سے مختلف مطلب صحیح ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ قرآن کی جو تفسیر احادیث میں آئی ہے کیا وہ واقعی رسول اللہ ﷺ کی بیان فرمودہ ہے؟۔ اس سلسلہ میں پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ پورے قرآن کریم کی تفسیر احادیث میں بیان ہی نہیں ہوئی، اس کی بہت تھوڑی سی آیات کی تفسیر بیان ہوئی ہے۔ بخاری میں تفسیر کا صرف ایک باب ہے اور اس میں چند جستہ جستہ آیات کی تشریح آئی ہے۔'' اس کے بعد ''مقامِ حدیث'' میں بہت سی ایسی روایات بیان کی گئی ہیں جو قرآن کریم کی تفسیر کے طور پر کُتبِ احادیث میں درج ہیں۔ لیکن وہ زبانِ حال سے کہہ رہی ہیں کہ وہ حضور کریم ﷺ کے اقوال و افعال نہیں ہو سکتے۔ لیکن فرقہ بند حضرات انہیں احادیث ہی ماننے پر مصر ہیں (موءلف)۔

(جاری ہے)

☆.....☆.....☆

راجہ عبدالعزیز (دھیرکوٹ آزاد کشمیر)

پانچویں قسط

متحرک نفسیات

Dynamic Psychology

گذشتہ قسط میں ابراہام ماسلو کی انسانی ضروریات کی ترجیحاتی فہرست میں تحققِ ذات (Self Actualization) کا بھی ذِکر ہوا تھا۔ تحقق ذات سے مراد ماسلو کے نزدیک فطری صلاحیتوں کی نشوونما اور فروغ کے لئے کوشاں رہنا اور اپنے میدان میں کمال حاصل کرنے کی خواہش ہے۔ غریبوں کی زیادہ تر تگ ودو جسمانی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ جبکہ خوشحال لوگ اپنی ذاتی عزت ووقار کے لئے اپنا بہت سا وقت اور وسائل صرف کرتے ہیں۔ ضروریات کی تسکین کا عام انداز اسی درجہ بندی کے مطابق ہوتا ہے۔ مگر ماسلو کے نزدیک اس میں بھی کچھ مستثنیات ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک مفلوک الحال آرٹسٹ اپنی غربت اور افلاس کے باوجود اپنے فن کی بلندیوں کو چھونے کے لئے کمربستہ رہتا ہے اور اپنی دیگر ضروریات کو مقابلتاً کم اہمیت دیتا ہے۔ ماسلو کے نزدیک دنیا میں ایسے اصول پسند اور نیک لوگوں کی بھی کمی نہیں جو تنگ دستی کے باوجود ناجائز ذرائع سے حاصل ہونے والی دولت کو ٹھکرا کر اپنی عزت نفس کو قائم رکھتے ہیں۔ ہر چند کہ تحققِ ذات کی ضرورت کی باری دیگر انسانی ضروریات کے بعد آتی ہے۔ لیکن یہ بھی انسانی فطرت کا اسی قدر اٹل اور لازمی حصہ ہے جس قدر دوسری ضروریات اور جب اس ضرورت کی تسکین کی راہ میں مشکلات درپیش ہوں تو فرد ذہنی طور پر بیمار ہو جاتا ہے۔ خوشحال معاشروں میں رہنے والے بعض افراد میں پایا جانے والا احساس بیگانگی، بے حسی، بے مروتی اور روحانی کرب کا سبب اسی ضرورت کی عدم تسکین ہے۔ ماسلو کا خیال ہے کہ اگرچہ انسان بنیادی طور پر مثبت فطرت کا مالک ہے، تاہم اس کی یہ فطرت زیادہ مضبوط نہیں۔ لہٰذا گردوپیش کے ناسازگار حالات، غلط تعلیم وتربیت، کم علمی، غیر صحت مند خیالات اور رویے اس پر اثر انداز ہو کر اس کی نشوونما کا فطری عمل معطل کر دیتے ہیں۔

تحققِ ذات کے تصور کی وضاحت کے لئے ماسلو نے کچھ ایسی شخصیتوں کی زندگیوں کا گہرا مطالعہ بھی کیا جو اس کے خیال میں تحقق ذات کی منزل پا چکے تھے اور اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح فروغ دے چکے تھے۔ آئن سٹائن، ابراہیم لنکن، ولیم جیمز، بیتھوِن، روز ویلٹ اور جیفرسن کا شمار ماسلو ایسے ہی لوگوں میں کرتا ہے۔ ماسلو نے ان کی زندگیوں کا تفصیلی مطالعہ کیا اور ان خصوصیات کا سراغ لگایا جو انہیں عام لوگوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ اس کے نزدیک یہ لوگ بے ساختہ، حقیقت پسند، خودمختار، غیر روایتی اور تخلیقی ہوتے ہیں۔ وہ خود کو اور دوسروں کو غیر مشروط طور پر قبول کرتے ہیں۔ ان کا ناطہ پوری انسانیت سے ہوتا ہے اور اپنے دوستوں اور نزدیکی لوگوں کے ساتھ گہرا اور پر خلوص تعلق رکھتے ہیں۔ جمہوری اقدار کے حامل ہوتے ہیں۔ حسِ مزاح رکھتے ہیں لیکن ان کا مزاح کسی کے لئے اذیت کا باعث نہیں

بنتا۔ یہ لوگ بعض اوقات روحانی تجربے سے بھی گزرتے ہیں جس میں وہ اپنے تئیں پوری کائنات کے ساتھ ہم آہنگی محسوس کرتے ہیں۔ یہ لوگ ماحول سے مطابقت اختیار کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس سے آگے کی نئی وسعتوں کو چھونا چاہتے ہیں۔ گویا ان کی شخصیت نہایت متوازن، بھرپور اور فطرت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہوتی ہے۔ ماسلو کردار پسند نفسیات دانوں کے اختیار کردہ میکانکی انداز فکر کو انسانوں کے لئے مناسب نہیں سمجھتا۔ اس کے خیال میں انسانوں کے مطالعہ کے لئے ایک ایسی انسانی نفسیاتی سائنس کو فروغ دینے کی ضرورت ہے جو دوران مطالعہ انسانی اقدار، انفرادیت، شعور، مقاصد، اخلاقی اقدار اور انسانی عزت و تکریم کے اعلیٰ تر پہلوؤں کو بھی پیش نظر رکھے۔ تاکہ انسان کے بارے میں مثبت اور خوش آئند خیالات کو فروغ دیا جاسکے۔

انسانی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر ماہرینِ نفسیات کے نظریات کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ شخصیت نفسیات کا ایک مرکزی اور نہایت پیچیدہ موضوع ہے، جس کی بنیاد، ساخت، اسباب اور نوعیت کے بارے میں ماہرین کے درمیان اختلافات پائے جاتے ہیں اور تاحال اس کا کوئی حتمی اور سائنسی نظریہ تشکیل نہیں پاسکا۔ شخصیت پر تفصیلی بحث تو بعد میں سامنے آئے گی، یہاں پر صرف مختلف نظریات کے اہم تصورات اور ان میں باہمی اختلاف کا مختصراً موازنہ پیش کیا جائے گا۔ اس بحث میں بنیادی لحاظ سے تین مکتبہ فکر سامنے آتے ہیں (1) تحلیل نفسی پر مبنی نظریاتِ شخصیت۔ (2) کردار پسند (آموزش پر مبنی نظریات اور (3) انسانیت پسند نظریاتِ شخصیت۔ تحلیلی نفسیات کے حامی ماہرین لاشعوری محرکات کو شخصیت کی تشکیل کے کردار کو چھوٹے ٹکڑوں (مہیج، ردِعمل وغیرہ) میں تقسیم کرتے ہیں جبکہ انسانیت پسند مفکرین کا خیال ہے کہ اس کی تشکیل میں فرد کے شعوری اور ارادی اعمال بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ (شہزاد احمد نے فرائڈ کی تحلیل نفسی کا تعلق انسان کی باطنی زندگی سے ظاہر کیا ہے)۔ تحلیل نفسی نظریات کے مطابق فرد بنیادی طور پر منفی رجحانات رکھتا ہے۔ انسانیت پسند نظریات فرد کو مثبت خصوصیات کا حامل قرار دیتے ہیں۔ جبکہ کرداریت کے ماننے والے ان دونوں نظریات کو رد کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ فرد پیدائشی طور پر نہ اچھا ہے نہ برا۔ وہ اپنے مخصوص ماحول میں جس طرح کے تجربات سے گزرتا ہے، اسی کے مطابق مخصوص عادتیں اور نظریات اپنا لیتا ہے۔ ان کی یہ بات تو درست لگتی ہے، مگر اس میں اتنا اضافہ کر دیا جائے تو بات کو مزید تقویت ملے گی کہ انسان کی یہ عادتیں یا تصورات حتمی نہیں ہوتے ان میں بھی تبدیلی کا عمل جاری رہتا ہے۔

تحلیل نفسی کے حامی جبریت کے قائل ہیں، یعنی ان کے خیال میں فرد کا کردار ایسے عوامل کے تابع ہے جن پر اسے کوئی اختیار نہیں۔ کرداریت پسند نظریات بھی اسی تصور کی تائید کرتے ہیں۔ جبکہ انسانیت پسند نظریات فرد کی آزادی کی بات کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنی روزمرہ زندگی میں اپنی مرضی اور آزادی سے کام کرتا ہے۔ انسان کی آزادی اور مجبوری یا جبر و قدر کا مسئلہ بہت پرانا ہے۔ ہر چند کہ وحیِ الٰہی نے ابتداء میں ہی آگاہ کر دیا تھا کہ انسان اپنے نظریات اور اعمال میں آزاد ہے لیکن نتائج کا سامنا کرنے پر مجبور ہے۔ اس کے باوجود اس موضوع پر صدیوں سے بحث جاری ہے۔ قدیمی حکماء اور علماء سے درگذر کرتے ہوئے اگر ہم جدید دور کی بات کریں تو بھی کئی بڑے بڑے مفکرین اور دانشور کسی نہ کسی پہلو سے انسان کو مجبور ہی قرار دیتے ہیں۔ مثلاً ڈارون نے میکانکی عمل اور فطری انتخاب کے تحت، فرائڈ نے انسان کے تمام اعمال کا محرک جنسی جذبہ قرار دے کر اور مارکس نے پوری انسانی تاریخ کو معاشیات کا غلام بنا کر

انسان کو مجبورِ محض قرار دیا ہے۔ تاہم جیسا کہ ہم انسانیت پسندوں کی صورت میں دیکھ رہے ہیں کہ بہت سے مفکرین انسان کی آزادی کے علمبردار ہیں۔ ان میں ایک سائنسدان اسٹیفن ہاکنگ بھی شامل ہیں وہ بھی ہر لحاظ سے انسان کو اپنے اعمال میں خودمختار اور آزاد خیال کرتے ہیں انہوں نے اپنی کتاب ''بلیک ہولز'' میں تقدیر پر تفصیل سے بحث کی ہے جس میں آزاد وجود اور مجبور جسم کو جاننے کے لئے ایک معروضی آزمائش (Test) کا ذکر کیا ہے یعنی

"Can one pridict the behaviour of the organism? If one can, Then it clearly doesnot have free will but is predetermined. On the other hand, if one cannot predict the behaviour, One could take that as an operational definition that the organism has free will."

انسانی رویے یا طرزِ عمل کے بارے میں کبھی بھی پیشین گوئی نہیں کی جاسکتی کیونکہ اسٹیفن کے نزدیک کسی بھی مساوات میں اگر دو سے زیادہ ذرات ہوں تو یہ بالکل درستگی سے حل نہیں کی جاسکتی صرف اندازہ ہی لگایا جاسکتا ہے۔ اور اگر پارٹیکل زیادہ ہوں تو پھر

"And the difficulty increases rapidly with the numbers of particles. The human brain contains about 10^{26} or a hunderd million billion billion particles. This is far too many for us ever to be able to solve the equation and predict how the brain would behave, given it initial state and the nerve data coming into it."

ان مکاتیب فکر میں مزید اختلافات بھی موجود ہیں مثلاً فرائڈ اور اڈلر کا خیال ہے کہ فرد کے بچپن کے تجربات اس کی آئندہ زندگی یا شخصیت کی نشوونما پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ کرداریت پسندوں کا بھی خیال ہے کہ عمر کے ابتدائی حصے میں سیکھی ہوئی عادتیں اور رویے آئندہ شخصیت کی تشکیل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جبکہ راجرز کا خیال مختلف ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ فرد کا موجودہ کردار صرف اس کے ماضی کے حالات کا تسلسل ہو اور فرد ہمیشہ انہیں کے تحت یا زیرِ اثر عمل کرے۔ اس کے علاوہ تحلیل نفسی کے ماہرین شخصیت کی تشکیل میں حیاتیاتی عوامل کے کردار کو بھی اجاگر کرتے ہیں جبکہ کرداریت پسند اور انسانیت پسند نظریات شخصیت کی تشکیل کا مطالعہ صرف نفسیاتی نقطہ نظر سے کرتے ہیں۔ البتہ ایرک فرام اور سلی ون کا خیال ہے کہ شخصیت کی تشکیل میں معاشرتی عوامل بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں جس کی تائید کرداریت پسند البرٹ بندورا نے بھی کی ہے۔

انسانی شخصیت مخلوقاتِ عالم کی پیچیدہ ترین نوع ہے۔ یہ انسانی شخصیت کے ان پیچ در پیچ اسرار کا ہی ادنیٰ سا کرشمہ ہے کہ علوم و فنون کا شاید کوئی شعبہ ایسا ہو جس نے انسانی شخصیت کی پردہ کشائی کی کوشش نہ کی ہو۔ فلسفہ، نفسیات، عمرانیات بشریات، تواریخ، شاعری، ادب و رقص، سائنس، معاشیات، مدنیات، الٰہیات، تصوف وغیرہ ان میں کونسا علم ایسا ہے جس نے انسانی شخصیت سے علاقہ نہ رکھا ہو اور اس کے کسی نہ کسی گوشے کی رمز شناسی کی کوشش نہ کی ہو۔ اس لئے شخصیت کی تعریف کی مانند شخصیت کو ٹھوس اور جامع انداز سے

بیان کرنا بھی نہایت مشکل امر ہے۔ دراصل شخصیت ایک معین چیز نہیں ہے بلکہ یہ نفسیات کا ایک ایسا وسیع اور اہم موضوع ہے جس کے مطالعے کے لئے دیگر موضوعات جیسے ادراک، محرکات، رویے، آموزش، جذبات و ہیجان، نشوونما، حافظہ، رجحانات، حسیات، توجہ، غور و فکر یعنی دماغی عمل، سوچ اور دیگر حرکاتی تنظیمات وغیرہ سے حاصل کردہ معلومات کو یکجا کیا جائے۔ کیونکہ شخصیت کی تشکیل کے عمل کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ مختلف شخصی خصوصیات کیسے نشوونما پاتی ہیں۔ لہٰذا یہاں شخصیت پر بات کرنے سے پہلے ان نفسیاتی عناصر کی مختصراً تعریف کر دینا مناسب رہے گا۔ پہلے مختصر سا تعارف انسانی رویوں کی تشکیل کے بارے میں کرتے ہیں کہ رویے کا وصف کیا ہے۔

عظیم یونانی فلسفی بقراط کے نظریے کے مطابق فرد طبعی اور جسمانی طور پر بعض میلانات رکھتا ہے۔ جو اس کی شخصیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جسمانی ساخت اور شخصیت کے حامی ماہرین نفسیات کے نزدیک فرد کی جسمانی ساخت اور نفسیاتی اوصاف ایک ہی قسم کے اندرونی جسمانی عنصر کی بنیاد پر تشکیل پاتے ہیں۔ پروفیسر ساجدہ نے رویے کا تعلق قدر سے بتایا ہے۔ ان کے مطابق ایک فرد میں بہت سے مخصوص رویے ہوتے ہیں۔ رویے اور ان کی نشوونما اپنے سیاق وسباق میں ظاہر ہوتے ہیں۔ انسان کی اقدار کی طرح رویوں کی نشوونما بچپن سے شروع ہو جاتی ہے۔ رویوں کی صورت گری میں جذبات کو بہت دخل ہوتا ہے۔ رویوں کی تشکیل اس طرح ہوتی ہے کہ پہلے کسی مخصوص شے یا فرد یا گروہ وغیرہ کا ایک خاص انداز سے ادارک کیا جاتا ہے۔ اور پھر اس کی طرف ایک مستقل جذباتی زاویہ (میلان) پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر یہ جذباتی زاویہ یا رجحان اوائلِ بچپن میں ہی پیدا ہو جائے تو شدید ہوتا ہے کیونکہ اس وقت تک عقلی، منطقی اور معروضی نقطہ نظر کی نشوونما نہیں ہوتی اور یہ جذباتی رجحان تقریباً بے سوچے سمجھے پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی نوکروں، محکوموں، اپنے سے کم حیثیت اور مجموعی طور پر کمزوروں کی طرف تحقیرانہ اور اپنے سے برتر لوگوں کی طرف عزت واحترام بلکہ خوشامدانہ روّیہ رکھنے والے گھرانوں کے بچوں میں ایسا ہی روّیہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مخاصمانہ رویہ فرد میں اس وقت تک رہتا ہے جب تک کہ وہ اپنے تجربے، عقل، مطالعہ، مشاہدہ یا دوسرے لوگوں کے اثرات سے یہ بات جان نہ لے کہ اس کا مخاصمانہ رویہ بے بنیاد ہے، فریق مخالف میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

ہمارے ہاں صدیوں سے مروّجہ جاگیردارانہ نظام کی کوکھ سے طبقاتی سماج نے جنم لیا جس کی وجہ سے یہاں پر حقیقی مساوات کا وجود کہیں نظر نہیں آتا۔ مذہبی تعصب کے علاوہ اس جاگیردارانہ رویے کے تحت ہمارے سماج میں برتر طبقے کی طرف خاکساری یا انکساری کا اور اپنے سے کم تر طبقوں کی طرف حکومت یا رعونت کا روّیہ عام ہے۔ اپنے سے بڑوں یعنی دولت، شہرت، درجات، کامیابی وغیرہ کے لحاظ سے بڑے لوگوں سے جھک کر ملنا ان کی چاپلوسی کرنا اور بے جا تعریفیں کرنا وغیرہ وغیرہ ہمارے معاشرے کے عام روّیے ہیں۔ رویے کی وضاحت کسی حد تک یوں بھی کی جاتی ہے کہ جذبات اور احساسات کے تلاطم کی وجہ سے جسمانی اور عضویاتی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں جس سے فرد میں ردِعمل پیدا ہوتا ہے یہی اس کا روّیہ ہے۔ یہ رویہ ان نظریات پر مبنی ہوگا جو جذباتی طور پر کسی خاص گروہ، اشخاص اور مقاصد کے ساتھ وابستہ کئے جاتے ہیں۔ رویوں کو ایک مستقل اکتسابی میلان بھی کہا جاتا ہے۔ رویوں کی تشکیل میں بچپن کے اثرات کا یقیناً بڑا دخل ہے۔ لیکن زندگی کے ہر دور میں، مختلف تاثرات اور تجربات کے نتیجے کے طور پر رویے بن اور ٹوٹ سکتے ہیں۔ انسان کے

تجربات جتنے وسیع اور مثبت ہوں گے اس کے رویے اتنے ہی وسیع القلب ہوں گے۔ رویے مثبت اور منفی دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔ کچھ نمایاں رویے یہ ہیں۔ تعصب، تنگ نظری، موقعہ پرستی، وسیع القلبی، دریا دلی، روشن خیالی، جبریت پسندی، رواج پرستی، توہم پرستی، علم دوستی، ادعائیت، سماج دشمنی، اصول پرستی، بے اصولی، رجعت پرستی، انقلابیت، دریا دلی، کینہ توزی، معروضیت، موضوعیت، مخلصانہ روّیہ، مخاصمانہ رویہ، دوستانہ رویہ، ریاکارانہ رویہ، بزدلانہ رویہ اور بے باکانہ رویہ وغیرہ وغیرہ۔

انسانی شخصیت کے تعینات میں رویے سے ملتا جلتا ایک اور عنصر قوتِ محرکہ ہے۔ محرک (Motive) لاطینی زبان کے لفظ 'Motivus' سے ماخوذ ہے جس کے معنی حرکت دینے والی شے یا قوت کے ہیں۔ جو فعل کسی نامیات سے سرزد ہو اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی محرک ضرور ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں محرک سے مراد فرد کی وہ ذہنی حالت ہے جو اس میں مقصدی سرگرمی پیدا کرتی ہے اور وہ منزل یا مقصد کو حاصل کرنے کے لئے سرگرم ہو جاتا ہے (New Comb) کے مطابق یہ عضویہ کی اس حالت یا کیفیت کا نام ہے جس میں توانائی کو یکجا کیا جاتا ہے اور اس کا رخ ماحول کے حصوں کی طرف موڑ لیا جاتا ہے۔ 'Lindsley' کے مطابق محرک نہ صرف سرگرمی پر آمادہ کرتا ہے بلکہ عضویہ کو فعل سرزد کرنے کی طرف مائل کرتا ہے تاکہ مقصد کی تکمیل ہو سکے۔ وڈورتھ کا بھی یہی خیال ہے۔ نفسیات کی بحث میں عموماً یہ سوال سامنے آتا ہے کہ آخر کار ہم عمل یا ردِعمل کیوں کرتے ہیں۔ اس کا جواب ماہرین نفسیات ولیم جیمز اور سیرل برٹ نے دیا تھا کہ ان کے خیال میں انسانی رویہ جبلت میں سے پھوٹتا ہے۔ درحقیقت انسانی اعمال اور افعال، اندرونی ضروریات، حاجات اور محرکات وغیرہ کا ایک پیچ در پیچ سلسلہ ہوتے ہیں جن کا سلسلہ بچپن سے ملتا ہے۔ پیدائش کے چند لمحے بعد سے انسانی بچہ اپنی جبلی حاجتیں پوری کرانے کے لئے کچھ ایسی حرکات سکنات کا اظہار کرتا ہے جس سے کسی مخصوص حاجت کا تعلق خاصا نمایاں ہوتا ہے۔ مثلاً بھوک لگتے ہی بچے کا رونا۔ ہم ایک خاص انداز سے کیوں سوچتے ہیں۔ ایک مخصوص طرز عمل کیونکر اپناتے ہیں۔ کسی مہم کو کیوں سر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انسانی فلاح و بہبودی کے کام کیوں کرتے ہیں۔ ان سوالوں کے جوابات کے لئے ہمیں انسانی کردار کی تشریح کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ انسانی کردار کی تشکیل آسمان پر نہیں ہوتی اور نہ ہی انسانی کردار کا مطالعہ خلا میں کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے انسان کا ذہن مخصوص ٹھوس حالات کے تحت تشکیل پاتا ہے۔ یہی حالات ایک مخصوص کردار کے لئے تحریک کا سبب بنتے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ بعض مخصوص حالات میں اپنی بقا وغیرہ یعنی جبلی تقاضات کے تحت ہماری حرکات غیر ارادی ہو سکتی ہیں مگر عموماً حرکات و اعمال با مقصد اور شعوری ہوتے ہیں۔

انسانی عمل میکانکی نہیں ہوتا کیونکہ میکانکی یا غیر ارادی عمل یا کردار شعور کے کنٹرول میں نہیں ہوتا۔ پروفیسر ساجدہ زیدی نے میکانکی عمل کا جائزہ یوں لیا ہے۔ ''انسانی عمل اگر بے مقصد، بے سمت، مہمل یا ہیجان خیز ہوتا۔ یا پھر مشینوں کی طرح تمام تر بیرونی عناصر کی کارکردگی کا نتیجہ ہوتا یعنی معنوی تحریک سے عاری ہوتا تو انسانی عمل کے محرکات تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ انسان کسی مشین کی طرح محض خارجی دباؤ اور تدابیر سے عمل پیرا نہیں ہوتا۔ مشینوں کے برعکس وہ از خود عمل کرنے سے قاصر نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس کا عمل کلیتاً خارجی دباؤ اور تحریکوں سے وجود میں آتا ہے۔ انسان کو ایک خودکار مشین سے تشبیہ دینا بھی غلط ہے اور ایک

سدھائے ہوئے کتے کے مماثل سمجھنا بھی غلط ہے۔ اور بندر سے تشبیہ دینا بھی درست نہیں۔ کیونکہ انسانی افعال و اعمال میں نہ تو خودکار مشینوں کی طرح کسی بٹن دبانے کی ضرورت ہے اور نہ ہی یہ افعال کسی ایسی خاص میکانکی ٹریننگ یا خارجی دباؤ کا نتیجہ ہوتے ہیں جن سے بعض جانور سدھائے جاتے ہیں''۔ انسانی محرکات کے حیاتیاتی تصورات کی رُو سے صرف بچپن کی حرکات ہی نہیں بالغ افراد کی زندگیوں کے پیچیدہ عملی اور مقصدی سلسلے بھی حیاتیاتی محرکات ہی سے وابستہ ہوتے ہیں۔ یعنی انسانی زندگی کے تمام محرکات کی بنیادی نوعیت حیاتیاتی ہوتی ہے۔ وہ پیدائشی و نسلی ہوتے ہیں اور بعض نظریات کے اعتبار سے موروثی بھی ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر بالغ افراد کے پیچیدہ عملی سلسلے ان ہی پیدائشی محرکات کی بدلی ہوئی تربیت یافتہ اور مہذب شکلیں ہوتی ہیں۔ ماہرین اس نظریے کو محدود حد تک قبول کرتے ہیں۔

جبلی نظریہ محرکہ کی رو سے انسانی پیدائشی جبلتیں ہی عمل کی تمام تر تحریک مہیا کرتی ہیں۔ میکڈوگل نے 1908ء میں بالغ افراد کے تمام اعمال کو اٹھائیس جبلتوں کا تابع بنایا اور ہر عمل کا رشتہ کسی نہ کسی جبلت کی حرکی قوت سے جوڑ دیا۔ ایک امریکی نفسیات دان کے فعلیتی نفسیات (Behaviourist Psychology) کے نظریے کے اثر سے محرکات کو بہت سطحی حیاتیاتی مظاہر سے وابستہ کر دیا گیا۔ ان جبلی یا حیاتیاتی نظریاتِ محرک کی رُو سے انسانی عمل کا پیٹرن کچھ ایسا بنتا ہے کہ انسان کے جسم میں کسی قسم کی کمی واقع ہوتی ہے (مثلاً خوراک کی کمی سے کیمیائی تبدیلی)۔ اس کمی سے جسم میں تناؤ (Tension) اور بے چینی کی کیفیت یعنی حالت اضطراب (Disequalibrium) پیدا ہوتی ہے۔ یہ بے چینی اور تناؤ انسان کو خوراک کی تلاش پر اکساتے ہیں جس کے ذریعے وہ اپنی حاجت پوری کرتا ہے اور حاجت پوری ہونے کے بعد جسم کی کیمیا پھر بدل جاتی ہے اس حالتِ سکون و ثبات کو Homeostateses کہتے ہیں۔ یعنی انسان کے عمل کا تمام تر مقصد حالتِ سکون و ثبات کی طرف رجوع ہے۔ دیگر ماہرین کے مطابق اس نقطہ نظر میں کوئی ایسی تشریحی قوت نہیں ہے جس کی بنا پر جبلتیں انسانی اعمال کے تمام محرکات کا سرچشمہ بن سکیں۔ پروفیسر ساجدہ بھی اس نظریے سے اختلاف رکھتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ''ہم نے دیکھا کہ حالت سکون و ثبات کے تصور کے پس پردہ یہ کلیدی تصور مضمر ہے کہ انسان کا زیادہ تر عمل (دوسرے جانوروں کی طرح) اس کی حیاتیاتی ضروریات اور خواہشات کو پورا کرنے کا ''ذریعہ'' ہوتا ہے۔ لہٰذا جیسے جیسے انسانی خواہشات آسودہ ہوتی جاتی ہیں۔ اس کی حیاتیاتی حاجتیں پوری ہوتی جاتی ہیں' اس کے عمل کے محرکات ختم ہوتے جاتے ہیں اور وہ بے عملی کی طرف مائل ہوتا جاتا ہے''۔ کیونکہ جب اس کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے تو اس کا تناؤ اور اضطراب ختم ہو کر وہ پھر حالتِ سکون میں پہنچ جاتا ہے' جب تک وہ دوبارہ حاجت محسوس نہ کرے۔ لہٰذا انسانی عمل دائروی (Circuler) عمل ہے ارتقائی عمل نہیں۔ جو زمینی حقائق کے خلاف ہے۔ نیز حیاتیاتی نظریات نے نسل انسانی کے سماجی' شعوری' نفسیاتی اور تخلیقی و تعمیری محرکات کو یا تو یکسر نظر انداز کر دیا یا انہیں حیاتیاتی جبلتوں کی تبدیل شدہ شکلیں قرار دے دیا۔ یعنی اس نظریے نے عموماً انسانی زندگی کے اعلیٰ مقاصد اور پیچیدہ اغراض سے اعراض برتا ہے۔ یہ نظریہ تحقیقی نفسیات (Reductive Psychology) کے دائرہ میں آتا ہے۔ کیونکہ وہ تمام محرکاتِ عمل کی تخفیف کر کے انہیں چند حاجتوں اور جبلتوں پر مرکوز کر دیتا ہے۔

پروفیسر ساجدہ کے مطابق ''بعد کے ماہرین نفسیات نے ان حیاتیاتی محرکات کو تخلیقی نظریات کہا ہے سے یہ اندازہ لگانا ناممکن ہے کہ مثلاً انسان حسین چیزوں کی طرف کیوں کھنچتا ہے؟ عبادت کیوں کرتا ہے؟ سائنسی اور علمی تلاش وجستجو میں کیوں مصروف ہوتا ہے؟ محبت وعشق میں ایثار وقربانی کی طرف کیوں مائل ہوتا ہے؟ تخلیقی عمل وتحقیق میں کیوں مستغرق ہوتا ہے؟ حسن، شعر ونغمہ، رنگ وآہنگ، علامت، پیکر، لوک گیتوں اور لوک کتھاؤں کی تخلیق کیوں کرتا ہے؟ وہ کونسے محرکات ہیں جنہوں نے پتھر کے زمانے کی نارسائی سے بتدریج تہذیب وتمدن کے مراحل طے کر کے انسان کو سائنس وعلم کی ترقی کے اس دور تک پہنچایا اور اس منزل تک پہنچ کر بھی اسے سکون نا آشنا بنا دیا؟ سکون وثبات کے اصول کے تحت تو آج کا انسان ترقی اور بہتات کی اس منزل پر پہنچ چکا ہے جس کے بعد اسے عمل کی ضرورت ہی نہیں رہی..... لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی، فطرت پر قابو پانے کی جدوجہد لامتناہی ہے''۔ مختصر یہ کہ انسانی نفسیات (Humanistic Psychology) کے زاویے سے یہ سب محرکی نظریات محدود اور ناقص ہیں۔

انسانی اعمال کے پیچھے کارفرما محرکات کے جائزے سے یہ حقیقت بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ انسان کے عمل کا بڑا حصہ لازماً مقصدی ہوتا ہے۔ ''اور مقصد سے مراد، زمانی ومکانی اعتبار سے قریب یا دور وہ منزل ہوتی ہے، جس کی جانب ہم عمل کے ذریعے سفر کرتے ہیں اور جس کی سمت، ہمارے کئی اعمال کے مربوط سلسلے کا رُخ ہوتا ہے''۔ مقصدی محرکات کا سلسلہ بڑا وسیع اور گہرا ہے ان محرکات کی نوعیت پورے سماج کا احاطہ کرتی ہے۔ اس لئے اس کی بحث اور فہرست خاصی طویل ہے جسے ایک مضمون میں بیان کرنا مشکل ہے۔ لہٰذا یہاں پر صرف محرکات کی درجہ بندی اور مختلف محرکات کی اقسام کی طرف اشارات کرنے کے بعد آگے چلیں گے۔ ماہرین نے محرکات کے سلسلے میں آنے والی پیچیدگیوں اور ابہام کو دور کرنے کی خاطر بنیادی لحاظ سے محرکات کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ (1) غیر اکتسابی محرکات اور اکتسابی محرکات۔ غیر اکتسابی محرکات میں تقریباً تمام جبلی یا حیاتیاتی محرکات شامل ہیں مثلاً بھوک وپیاس، نیند وتھکان، سردی گرمی، سانس، عضلات کا کھچاؤ، جنسی محرک اور تماست (Contact) کا محرک وغیرہ۔ اکتسابی محرکات میں جارحیت، وابستگی، طاقت، اصول، مقصد، رتبہ، ہمدردی، بھلائی، ایثار، دشمنی، تجسس یا کھوج اور سرگرمی وغیرہ کے محرکات شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بھی دیگر کئی محرکات ہیں۔ ان محرکات کے علاوہ محرکات کا نسبتاً زیادہ پیچیدہ نظریہ فرائڈ اور اس کے متاخرین کا ''جبلی نظریہ محرکات'' ہے۔ فرائڈ نے بھی بعض بے حد بنیادی جبلتوں پر اپنے تحلیل نفسی نظریات کی بنیاد رکھی۔ فرائڈ کا اولین نظریہ یہ تھا کہ دو جبلتیں انسانی شخصیت میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں (1) جبلت جنسی (Sex instinct) اور (2) جبلت جارحیت (Instinct of Agression) فرائڈ نے ان دونوں جبلتوں کا وسیع تصور پیش کیا تھا اور بہت سے محرکات کو ان کی ذیلی حیثیت دی تھی۔ اس کے علاوہ فرائڈ کا جبلتوں کے تغیرات کا نظریہ بھی بہت حرکی تھا۔ انسانی نشوونما اور ارتقائی عمل میں جو تبدیلیاں اور تغیرات پیدا ہوتے ہیں، فرائڈ نے متعدد قسم کے محرکات کو ان کا زائید کہا اور یہ بھی واضح کیا کہ یہ محرکات بڑی حد تک لاشعوری ہوتے ہیں اور شعوری سطح پر وہ طرح طرح کے بھیس بدل کر اور علامتی پیرایوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ فرائڈ نے دو جبلتوں، قوتِ حیات (Erose) اور رجحان موت وتخریب (Thanatos) کا بھی اضافہ کیا۔

انسانی روّیے سے ملتا جلتا ایک وصف رجحان (Aptitude) ہے۔اس وصف کا تعلق اطلاقی نفسیات سے ہے۔اور یہ نفسیاتی آزمائشوں کی اقسام میں سے ایک قسم ہے۔گذشتہ چند دہائیوں سے فرد کی نفسیاتی خصوصیات جانچنے کے لئے ہزاروں آزمائشیں مرتب کی جارہی ہیں اور ان میں اضافہ بھی ہورہا ہے۔ان آزمائشوں کو بنیادی طور پر چار اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔(1) رجحان کی آزمائش۔(2) حصول کی آزمائش۔(3) ذہانت کی آزمائش۔(4) شخصیت کی آزمائش۔رجحان سے مراد فرد میں موجود وہ صلاحیت ہے جو مستقبل میں کسی مخصوص شعبے میں اچھی کارکردگی ظاہر کرنے میں اس کی مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔رجحان کی آزمائش یہ ظاہر کرتی ہے کہ فرد مستقبل میں تعلیم وتربیت سے کیا کچھ حاصل کرسکے گا۔مثلاً ایک فرد جو گاڑی چلانا نہیں جانتا اس کی صلاحیتوں کی پیمائش سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک مخصوص سمت میں دیکھتے ہوئے مخصوص حرکی اعمال سرانجام دے سکتا ہے' کیونکہ یہ صلاحیتیں گاڑی چلانا سیکھنے کے لئے کارآمد ہیں' اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ فرد میں ڈرائیونگ سیکھنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔رجحان کی ایک آزمائش تفریقی آزمائش (Differantial aptitude test) بہت وسیع پیمانے پر استعمال کی گئی ہے۔اس آزمائش کے ذریعے مختلف رجحانات مثلاً لفظی (Verbal) رجحان' عددی (Numerical) رجحان' میکانکی (Mechanical) رجحان اور کلیریکل صلاحیت (Clerical Ability) وغیرہ کی پیمائش کی جاتی ہے۔اس کے علاوہ ایسی آزمائشیں بھی ہیں جو صرف ایک مخصوص رجحان کی پیمائش کرتی ہیں۔مثلاً میئر آرٹ ججمنٹ ٹسٹ (Meier Art Jedgement Test) فرد میں فنونِ لطیفہ کو پرکھنے کی صلاحیت کی پیمائش کرتی ہے۔اسی طرح فرد کی موسیقی سیکھنے کی صلاحیت کی پیمائش کے لئے بھی آزمائش مرتب کی گئی ہے۔

پروفیسر ساجدہ زیدی نے انسانی رجحان اور رویے یعنی 'Aptitude اور 'Attitude' کو ایک ہی معنی میں بیان کیا ہے اور رجحان' رویے اور مزاج وغیرہ کا اقدارِ حیات کے ساتھ گہرا تعلق ظاہر کیا ہے۔اخلاقی اقدار پر پہلے بھی قدرے تفصیلی بات ہوچکی ہے۔لیکن پروفیسر صاحبہ نے اس معاملے کے کچھ دیگر نفسیاتی وسماجی پہلوؤں پر بڑی تفصیلی روشنی ڈالی ہے اس لئے یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نقطہ نظر بھی مختصر طور پر سامنے لایا جائے۔انہوں نے رجحانات کو اوصاف سے بھی زیادہ ہمہ گیر تصور قرار دیا ہے اور ان کو مخصوص شخصی میلان (Tendencies) کہا ہے۔ان کے مطابق ایک شخصیت میں اوصاف تو متعدد ہوسکتے ہیں لیکن اس کے برخلاف رجحان ایک وسیع تر مفہوم ہے اور ہر چند کہ ایک شخصیت میں کئی رجحانات ہوسکتے ہیں' لیکن بہت زیادہ تعداد میں رجحانات کا پایا جانا قرینِ قیاس نہیں ہے۔رجحانات بھی اوصاف کی طرح طرزِ احساس وعمل کا تعین کرتے ہیں لیکن ان کا دائرہ کار وسیع ہوتا ہے۔بلکہ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو رجحانات ہی اوصاف کا منبع ہیں۔ان کے نزدیک بعض ماہرین نفسیات نے جو رجحانات کو اوصاف ہی کی عمومی شکل گردانا ہے' رجحانات کی بڑی محدود تعریف ہے۔رجحانات دراصل شخصیت کا رُخ متعین کرتے ہیں' فرد کی رغبتوں اور نفرتوں کا تعین کرتے ہیں۔یہ ہمیں بتاتے ہیں کہ کوئی شخص مخصوص طور پر کس طرزِ فکر وعمل اور طرزِ احساس پر مائل ہوگا' کن چیزوں کی طرف راغب ہوگا اور کس کس قسم کے اوصاف کا حامل ہوگا۔اگرچہ یہ تعین بھی بندھا ٹکا نہیں ہوگا۔اس کے مقررہ سانچے نہیں ہوتے اور نہ ہی یہ ہر فرد کے اندر یکساں ہوگا۔

(جاری ہے)

☆.....☆.....☆

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
021-35854919
Skype: AZURE.ABBAS
www.azharabbas.com

وحی خفی کا محکیٰ عنہٗ روایات میں موجود نہیں ہے

قرآن کریم نے تمام گزشتہ انبیاء کرام کی تصدیق اور ان پر ایمان لانا ضروری قرار دیا ہے۔ مسلمانوں میں اس عقیدہ کی بنیاد پر یہودیوں کو یہ غلط تاثر تھا کہ مسلمان اپنا قبلہ بھی بیت المقدس کو ہی قرار دیں گے۔ بالخصوص اس وجہ سے اور یہ بھی کہ کعبہ اس وقت تک بُت کدہ بن چکا تھا، اور اس لئے مسلمان اسکو اپنا قبلہ قرار نہیں دے سکتے۔ لیکن مسلمانوں نے کعبہ ہی کو اپنا قبلہ مقرر کر دیا تو یہودیوں کو یہ بات بڑی ناگوار گزری اور ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ کعبہ قریش کی تولیت میں ہے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں نے اس کو ہی اپنا قبلہ قرار دے دیا ہے اور بیت المقدس کو قطعاً کوئی اہمیت نہیں دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہودیوں نے چونکہ دین کو نسلی بنا رکھا تھا اس لئے بیت المقدس ان کا قبلہ بن سکتا تھا، لیکن اسلام چونکہ ایک عالم گیر دین تھا اس لئے اس کا قبلہ بیت المقدس نہیں بن سکتا تھا، اس کا قبلہ بھی بین الاقوامی ہونا چاہئے تھا جس آیہ کریمہ سے تحویلِ قبلہ کا عقیدہ اخذ کیا جاتا ہے وہ آپ ملاحظہ فرمائیں ارشاد ہوتا ہے:۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۭ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۭ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (2:142)

ترجمہ: بعض احمق لوگ یہ کہیں گے کہ مسلمان جس قبلہ (بیت المقدس) کی طرف پہلے تھے اس سے دوسری طرف مڑ جانے کا کیا سبب ہوا۔ اے رسولؐ تم اس کے جواب میں کہو کہ مشرق و مغرب سب خدا کا ہے، جسے چاہتا ہے راستہ کی طرف ہدایت کر دیتا ہے۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر کے ذیل میں حضرت مولانا عثمانی صاحب نے تحریر فرمایا ہے ''حضورؐ جب مدینہ سے مکہ تشریف لائے تو سولہ سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے رہے اس میں کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم آ گیا تو یہود و مشرکین اور منافقین اور کچے مسلمان ان کے بہکانے سے شبہے ڈالنے لگے کہ یہ تو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے جو قبلہ نما پہلے انبیاء کا ہے اب انہیں کیا ہوا جو اس کو چھوڑ کر کعبہ کو منہ کرنے لگے۔ کسی نے کہا کہ یہود کی عداوت پر ایسا کیا۔ کسی نے کہا کہ یہ اپنے دین میں متردد و متحیّر ہیں جن سے انکا نبی اللہ ہونا ظاہر نہیں ہوتا۔ مخالفوں کے اس اعتراض اور اس کے جواب میں جو آگے ہے، اللہ نے اطلاع فرما دیا کہ کسی کو اس

وقت تردد نہ ہو، اور جواب میں تامل نہ ہو''۔

تفسیر معارف القرآن میں رقم ہے ''حضرت خاتم الانبیاء پر جب نماز فرض کی گئی تو بقول بعض علماء ابتداءً آپؐ کے جدِ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ یعنی خانہ کعبہ ہی قرار دیا گیا۔ مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے اور مدینہ طیبہ میں قیام کرنے کے بعد اور بعض روایات کے اعتبار سے ہجرت مدینہ سے کچھ پہلے آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ آپ بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنائیے۔ صحیح بخاری کی روایات کے مطابق آنحضرتؐ نے سولہ سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف نماز ادا فرمائی۔ مسجد نبوی میں آج تک اس کی علامت موجود ہے جہاں کھڑے ہو کر آپؐ نے بیت المقدس کی طرف نماز ادا فرمائی تھی۔ بہرحال ہجرت مدینہ کے سولہ سترہ مہینے بعد آپ کا اور مسلمانوں کا قبلہ خانہ کعبہ کو بنایا گیا۔ اس پر یہود اور بعض مشرکین و منافقین آنحضرتؐ پر یہ اعتراض کرنے لگے کہ ان کے دین کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں ان کا قبلہ بھی روز بروز بدلتا ہے۔ (جلد اول۔ صفحہ 362)

تفسیر ضیاء القرآن میں ہے ''جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضورؐ اپنے صحابہ کرامؓ کے ساتھ مسجد بنی سَلَمَہ میں ظہر کی نماز با جماعت ادا کر رہے تھے۔ دو رکعت ادا فرما چکے تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی۔ اسی وقت حضورؐ نے بیت المقدس سے منہ موڑ کر کعبہ کی طرف رخ کر لیا۔ صحابہ کرامؓ نے بھی اپنے رخ کعبہ کی طرف پھیر لئے۔ مدینے کی دوسری مسجدوں میں بھی جہاں جہاں جماعت ہو رہی تھی جب یہ حکم پہنچا تو اسی لمحہ تمام صحابہ نے اپنے رخ پھیر لئے اور دنیا کو تسلیم و رضا کا ایک بے مثال نمونہ دکھا دیا۔ (جلد-ا۔ صفحہ 103)

تفسیر نمونہ میں تحریر ہے۔ ''ایک روز مسجد بنی سَالم میں پیغمبرؐ نماز ظہر پڑھا رہے تھے۔ دو رکعت ادا فرما چکے تھے کہ جبرئیل کو حکم ہوا کہ پیغمبرؐ کا بازو تھام کر ان کا رخِ انور کعبہ کی طرف پھیر دیں''۔

اس آیت کا شانِ نزول اور اس کی تفسیر تقریباً تمام تفاسیر میں اسی طرح آئی ہے لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس آیت میں یا اس سے ماسبق یا مابعد کی آیات میں کہیں بھی نماز کا ذکر ہی نہیں ہے۔ معلوم نہیں ہمارے مفسرین کرام نے اس آیت کو نماز کے ساتھ کس طرح منسلک کر دیا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ یہ تفسیر اس وقت تحریر کی گئی ہے جب دین کا تصور مذہب میں تبدیل ہو چکا تھا۔ دین میں تو صبح سے شام، اور شام سے صبح تک ہر وقت رخ اور توجہ صرف کعبہ کی طرف ہوتی ہے۔ اور کعبہ امت مسلمہ کا ایک محسوس مرکز ہوتا ہے جس کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی۔ حضور ﷺ نے جب اپنی مملکت قائم فرمائی تو بیشک آپؐ کا دارالخلافہ مدینہ تھا۔ لیکن اس نظام کا مرکز کعبہ ہی تھا۔ مسلم مملکتیں آئیں اور ختم ہوئیں لیکن ان کا مرکز بھی کعبہ ہی تھا۔ قرآن کی رو سے کعبہ پوری انسانیت (الناس) کا مرکز ہے۔ مسلمانوں کی مملکتیں آئندہ بھی قائم ہوں گی اور منقرض ہوں گی۔ ان کے دارالخلافے دنیا کے مختلف شہر ہوں گے لیکن مسلمانوں کا مرکز خانہ کعبہ ہی رہے گا۔ اسلامی حکومت ختم ہوئے صدیاں بیت گئیں۔ حج اس حکومت کا سالانہ اجتماع تھا۔ اسلامی حکومت ختم ہونے کے باوجود حج اب بھی بدستور قائم ہے۔ اگر کبھی مسلمانوں کی قسمت نے یاوری کی، اور اسلامی مملکت قائم ہو گئی تو کعبہ سے ہی ہدایت جاری ہو گی اور حج کے نتائج بھی برآمد ہونے شروع ہو جائیں گے۔ دین کے نقطہ نگاہ سے اس آیت کی موجودہ تفسیر

درست نہیں ہوسکتی۔

دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ کعبہ تو اول دن سے تمام انبیاء کرامؑ کا قبلہ تھا۔ بیت المقدس تو کبھی بھی قبلہ نہیں ہوا۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّہُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (3:96)

ترجمہ: بیشک پہلا گھر جو لوگوں کے لئے مقرر کیا گیا وہ مکہ ہے، بابرکت ساری دنیا کے لئے ہدایت۔

اس آیت نے یہ بات واضح کردی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آدمؑ سے لے کر حضور ﷺ تک صرف ایک ہی مرکز مقرر کیا گیا ہے جو مکہ ہے۔ یہ بات فرض کرنی کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا تھا اور ہجرت نبوی کے بعد بیت المقدس کی بجائے کعبہ قبلہ قرار دیا گیا درست نہیں ہے۔ آپؐ نے کبھی بیت المقدس کو قبلہ نہیں ٹھہرایا اور نہ کبھی نماز اس کی طرف رخ کر کے ادا کی۔ حضور ﷺ جب مکہ میں پیدا ہوئے تو وہاں اس وقت ایسے لوگ موجود تھے جو ملت ابراہیمؑ کے متبع تھے اور حنیف کہلاتے تھے اور جو ابراہیمؑ کی پیروی میں مکہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ حضورؐ کو بھی ملت ابراہیمؑ کے اتباع کا حکم ہوا تھا اسی لئے لازمی ہے کہ آپؐ نماز کعبہ کی طرف رخ کر کے ہی ادا کرتے ہوں گے۔

ہمارے علماء نے اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ

اب کہیں گے بیوقوف لوگ کہ کس چیز نے پھیر دیا مسلمانوں کو ان کے قبلہ سے جس پر وہ تھے۔ (معارف القرآن)۔ لیکن اگر روایات پیشِ نظر نہ ہوں تو اس کا درست ترجمہ یہ ہے۔ یہ بیوقوف لوگ (یہودی) کہیں گے کہ مسلمانوں کو کس چیز نے پھیر دیا اس قبلہ سے جس پر وہ (یہود) ہیں۔ التی کانو اعلیھا سے مراد مسلمان نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد وہ یہود ہیں جو اب بھی بیت المقدس کو اپنا قبلہ قرار دے رہے ہیں۔ یہودیوں کو تعجب اس بات پر تھا کہ جب مسلمانوں نے ان کے تمام انبیاءؑ کو تسلیم کرلیا تو ان کا قبلہ کیوں تسلیم نہیں کیا۔ اور بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ کو قبلہ کیوں بنایا۔

اس آیت سے آگے ارشاد ہوتا ہے۔ وَمَا جَعَلۡنَا الۡقِبۡلَۃَ الَّتِیۡ کُنۡتَ عَلَیۡہَاۤ اِلَّا لِنَعۡلَمَ مَنۡ یَّتَّبِعُ الرَّسُوۡلَ مِمَّنۡ یَّنۡقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیۡہِ (2:143)

ترجمہ: اور نہیں مقرر کیا تھا ہم نے وہ قبلہ کہ جس پر تو پہلے تھا مگر اس واسطے کہ معلوم کریں کون تابع رہے گا رسول کا اور کون پھر جائے گا الٹے پاؤں۔

ہمارے مفسرین کرام روائت کے زیر اثر پہلے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیکر اس آیت میں بھی الَّتِیۡ کُنۡتَ عَلَیۡہَاۤ سے مراد بیت المقدس ہی لیتے ہیں جبکہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ بیت المقدس کو قبلہ اول قرار دینا ہی خود قرآن کے خلاف ہے لیکن بیت المقدس کو قبلہ قرار دے کر اس مفروضہ پر ہمارے مفسرین کرام یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ''اس آیت کو سمجھنے کے لئے اس کا پس منظر اور شانِ نزول سمجھنا ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی مدینہ منورہ کے بعد مکی زندگی کے ابتدائی دنوں میں مسلمانوں کو حکم تھا کہ وہ اپنی نمازیں بیت المقدس

کی جانب رُخ کر کے ادا کریں۔ گویا بیت المقدس کو قبلہ متعین کر دیا گیا تھا۔ سترہ ماہ تک مسلمان بیت المقدس کو بطور قبلہ اختیار کئے رہے۔ سترہ ماہ کے بعد قرآن کریم نے سابقہ حکم منسوخ کر دیا اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ مسجدِ حرام کو اپنا قبلہ قرار دیں اور نمازوں میں اسی طرف رُخ کریں''۔

بیت المقدس کے قبلہ اول ہونے کے مفروضہ پر: وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا، سے ہمارے علماء کرام یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ ''یہاں سابقہ مقرر کردہ قبلہ کے حکم کی خود اللہ تعالیٰ کی جانب نسبت کی گئی ہے جس سے واضح ہے کہ بیت المقدس کو خود اللہ تعالیٰ کے حکم سے قبلہ مقرر کیا گیا تھا۔ اب قرآن کریم کو شروع سے آخر تک پڑھا جائے۔ اس حکم کا قرآن میں کہیں ذکر نہیں ملے گا نہ کوئی ایسی آیت ملے گی جس میں بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا حکم موجود ہو۔ درحقیقت یہ حکم خود آنحضرت ﷺ نے قرآن کریم کی کسی آیت کے حوالے کے بغیر دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود قرآن کریم میں اسے اللہ کا حکم قرار دیا گیا ہے۔ اس آیت میں یہ الفاظ نہیں کہے گئے کہ 'رسول اللہؐ نے قبلہ اس لئے مقرر کیا تھا' بلکہ الفاظ یہ ہیں 'ہم نے قبلہ اسی لئے مقرر کیا تھا''۔

جو اقتباس اُوپر تحریر کیا گیا ہے اس کے بعد اس اقتباس کے نتیجے کے طور پر تحریر ہے ''یہ اتنا واضح ثبوت ہے کہ اس کی مزید تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن کریم کا یہ بیان ثابت کرتا ہے کہ سابقہ حکم جو رسالت مآب نبی کریمؐ کی جانب سے دیا گیا تھا۔ ایک ایسی وحی پر مبنی تھا جو کہ قرآن کا جز نہیں تھی۔ اور یہی وحی غیر متلو کا مطلب ہے''۔

اقتباسات درج کرنے سے مضمون MONOTONOUS بوجھل بن جاتا ہے، لیکن اس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں کہ اس کا اندراج ضروری تھا۔ ان تمام اقتباسات میں وحی خفی کے عقیدے کو ثابت کیا جا رہا ہے لیکن چونکہ ان اقتباسات کی بنیاد ہی تحویلِ قبلہ کے غلط مفروضہ پر قائم ہے اس لئے ان کا نتیجہ درست نہیں ہے کہ 'ہم نے قبلہ اس لئے مقرر کیا تھا' کے الفاظ قرآن میں موجود نہیں لہٰذا یہ بھی وحی خفی تھے۔

ہمارے علماء کرام وحی خفی کے عقیدے کے ثبوت میں یہ موقف اختیار کرتے ہیں اور چند آیات سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہوا اور رسول اللہ ﷺ نے اس پر عمل فرمایا لیکن اس حکم کے الفاظ قرآن میں نہیں ہیں فلھذا 'وحی خفی' تھے، جو روایات ہیں بیان کر دی جاتی ہیں۔ اسی آیت کریمہ میں بھی 'ہم نے قبلہ اس لئے مقرر کیا تھا' کے الفاظ وحی خفی قرار دئے جا رہے ہیں لیکن آپ کو حیرانی ہوگی کہ جس وحی خفی کا استدلال ان الفاظ سے کیا جا رہا ہے، یہ وحی خفی کسی حدیث میں موجود نہیں ہے۔ کسی بھی وحی خفی کا محکیٰ عنہٗ روایات میں نہیں ملتا۔ جب وحی خفی کا محکیٰ عنہٗ روایات میں موجود ہی نہیں ہے تو پھر ان آیات سے وحی خفی کا استدلال کرنا ہی بے بنیاد بات ہے۔

معزز قارئین کرام کے لئے محکیٰ عنہ کا مفہوم واضح کرنے کے لئے چند اور مثالیں پیشِ خدمت کی جاتی ہیں۔

ماہنامہ 'محدث' اہلِ حدیث حضرات کا ایک مشہور اور معتبر علمی رسالہ ہے اِس رسالہ میں اکتوبر 1995 کے ایشو میں ایک مضمون بعنوان 'سنتِ نبوی وحی پر مبنی اور محفوظ ہے' طبع ہوا تھا۔ وحی خفی کے ثبوت کے بارے میں انہوں نے بھی یہی موقف اختیار کیا تھا اور اسی

طرح چند آیات سے استدلال فرمایا تھا، اس رسالہ میں تحریر ہے:

''ارشاد ہوتا ہے وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا (9:84)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے نزول سے قبل ہی نماز جنازہ شروع ہو چکی تھی اور رسول اللہؐ اموات کے جنازوں پر نماز پڑھا کرتے تھے حالانکہ قرآن میں جنازے ہونے والی اس سے پہلے کوئی آیت نہیں بتائی جا سکتی جس میں نبیؐ کو یا مسلمانوں کو نماز جنازہ پڑھنے کا حکم دیا گیا ہو''۔ اقتباس ختم ہوا۔

اس جگہ پھر وہی اعتراض ہوتا ہے کہ اگر قرآن میں ایسی کوئی آیت نہیں ملتی تو روایات میں بھی کوئی ایسا حکم نہیں ملتا کہ جنازہ کی نماز پڑھا کرو۔

(2) موقر رسالہ 'محدث' میں دوسری مثال یوں تحریر ہے:

''قرآن کریم میں ہے وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ۭ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ (66:3)

ترجمہ: اور جب نبی علیہ السلام نے کسی وجہ سے اپنی ایک بات چپکے سے فرمائی مگر جب آپ کی اس زوجہ نے وہ بات (دوسری بیویوں کو) بتلا دی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے باخبر کر دیا تو آپ نے تھوڑی سی بات بتلا دی اور تھوڑی سی بات ٹال گئے۔ جب آپ نے اس بیوی کو وہ بات جتلائی تو وہ کہنے لگی آپ کو کس نے خبر دی۔ آپ نے فرمایا مجھے علیم وخبیر نے مطلع کیا۔

لیکن قرآن کریم کی کسی بھی آیت میں علیم وخبیر کا اپنے نبی کو اس بات سے مطلع کرنا مذکور نہیں ہے کہ آپ کی اس زوجہ نے آپ کا راز دوسری بیویوں کو بھی بتا دیا ہے پس معلوم ہوا کہ قرآن کے علاوہ بھی نبی کے پاس وحی آتی تھی جس کے ذریعہ آپؐ کو اس واقعہ سے باخبر کیا گیا تھا''۔ اقتباس ختم ہوا۔

'محدث' اس جگہ پر یہ استدلال کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود وحی خفی کے ذریعے یہ بات بتائی تھی کہ آپ کی زوجہ محترمہ نے آپ کا راز فاش کر دیا ہے اور وہ وحی خفی قرآن میں نہیں ہے بلکہ قرآن کے باہر ہے۔ یہاں پر یہ اعتراض بنتا ہے کہ اس وحی خفی کا محکی عنہٗ روایات میں بھی موجود نہیں ہے۔ حدیث کی کسی کتاب میں یہ موجود نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو اس افشائے راز کی خبر دی تھی۔ رسالہ کے اس مضمون کا عنوان ہی یہ ہے کے 'سنتِ نبوی وحی پر مبنی اور محفوظ ہے'۔ ہمارا سوال یہ ہے کہ اگر وحی خفی کے ذریعے حضورؐ کو افشائے راز کی اطلاع دی گئی تھی تو اس وحی خفی کو کتبِ احادیث میں محفوظ ہونا چاہئے تھا جو کہ فی الحقیقت نہیں ہے۔

(3) وحی خفی کے ثبوت میں موقر ماہنامہ 'محدث' ایک اور آیت رقم کرتا ہے۔ ارشاد ہے کہ

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَاۗىِٕمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ (59:5)

ترجمہ: جو کھجوروں کے درخت کے تنے تم نے کاٹے یا ان کو جڑوں پر کھڑا رہنے دیا تو یہ چیز اللہ تعالیٰ کے حکم (اور رضا) کے مطابق ہے۔

لیکن مدینہ منورہ میں بسنے والے یہودی قبیلہ بنونضیر کی بدعہدی کے نتیجے میں کی جانے والی اس تادیبی کارروائی میں جس 'اِذن الٰہی' کا تذکرہ ہے وہ قرآن کریم میں کہیں مذکور نہیں چنانچہ علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں:

ولا نجدُ فی القرآن ذلک اذن فثبت قطیعا انّ الرسول کان یا تیہ الوحی ایضا کما قلنا سابقا

رسالہ نے علامہ ابنِ کثیر کے اس اقتباس کا ترجمہ نہیں لکھا۔ ہمارے پاس یہ مضمون مکمل نہیں ہے۔ اس کے آخری صفحات ہمارے پاس نہیں ہیں۔ ممکن ہے اس کا ترجمہ آخر میں درج ہو۔ لیکن ہم خود اس کا ترجمہ درج کرتے ہیں۔ 'ہم اس اذن (اجازت) کو قرآن میں کہیں نہیں پاتے بس قطعی طور پر ثابت ہوا کہ رسول اللہؐ کے پاس اور وحی بھی آتی تھی، جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے'۔ لیکن رسالہ اور علامہ ابنِ کثیر کے قول پر ہمارا پھر وہی اعتراض ہے کہ اگر یہ اذن (اجازت) قرآن میں نہیں ہے تو اس وحی خفی کا محکیٰ عنہٗ کتب احادیث میں بھی موجود نہیں ہے پھر اس وحی خفی کو محفوظ کیسے مان لیا جائے۔

(4) محدث، اس بارے میں اگلی آیت پیش کرتا ہے:۔

وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ (5:58)

ترجمہ: اور جب نماز کے لئے پکارتے ہو (اذان) تو وہ لوگ اس کے ساتھ ہنسی اور کھیل کرتے ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو عقل نہیں رکھتے۔

مندرجہ بالا آیت کریمہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے بھی اذان ایک دینی عمل کی حیثیت سے رائج تھی لیکن قرآن میں کوئی ایسی آیت نہیں بتائی جاسکتی جس کے ذریعہ اذان کا حکم دیا گیا ہو' (اقتباس ختم)

لیکن حیرانی اور اعتراض کی بات یہ ہے کہ کتب روایات میں کوئی ایسی روایت نہیں بتائی جاسکتی جس کے ذریعہ اذان کا حکم دیا گیا ہو۔

ہمارے علماء کرام کا یہ استدلال کوئی علمی حیثیت نہیں رکھتا باقی رہا آیات کا وہ درست مفہوم جو وحی خفی کی مدد کے بغیر لیا جاتا ہے اس سے پیشتر کئی مرتبہ رسالہ ھذا میں پیش خدمت کیا جا چکا ہے۔ اگر کسی صاحب کو ان آیات کے مفہوم کی ضرورت ہو تو وہ مفہوم القرآن یا تفسیر القرآن، با آیات القرآن یا بیان للناس کا مطالعہ فرمائیں ان تفاسیر میں ان آیات کا مفہوم واضح کر دیا گیا ہے۔ اگر مزید تشنگی محسوس ہو یا کسی خاص آیۂ کریمہ پر کوئی تحقیقی کام کرنا پیش نظر ہو تو 'مطالب القرآن' اور 'دروس القرآن' سے مدد لی جاسکتی ہے۔ ان دروس میں ہر آیت کا مفہوم بغیر وحیِ خفی کی مدد کے بہت واضح کر دیا گیا ہے۔ البتہ اس میں محنت بھی درکار ہوگی اور سابقہ مفسرین کے راستوں کو بھی چھوڑنا ہوگا۔

منزلت دور است و بارت بس گراں
کوششے کن پس ممان از دیگراں

☆.....☆.....☆

آصف جلیل

الهداية والعرفان فی تفسير القرآن بالقرآن
محمد ابو زيد الدمنهوری

سورۃ العنکبوت

(۸) الاحقاف اور لقمان پڑھئے اور جان لیں کہ اللہ تعالیٰ نے فضیلت میں والدین کو اپنے بعد کا درجہ دیا ہے، جیسا کہ آپ الاسراء اور النساء میں دیکھتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اس کی معصیت میں ان کی اطاعت کی جائے۔ کیا اس بات کا خیال وہ لوگ رکھتے ہیں جو حکمرانوں اور لذتوں کے طلبگاروں کی ہر وہ بات مان لیتے ہیں جو اللہ کی معصیت ہوتی ہے۔

(۲۴۔۲۷) (فَأَنْجٰهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ) پڑھئے اور (انی مهاجر الی ربی) پھر پڑھئے تو یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ وہ (حضرت ابراہیمؑ) ہجرت کرنے کی وجہ سے بچ گئے۔ (آگ سے)۔ سورۃ ابراهيم کو دہرائیے تاکہ اس قصے کے بارے میں جو کچھ آیا ہے وہ جان سکیں پھر الحدید کا آخری حصہ پڑھیں۔

سورۃ الروم

(۷۔۱۹) بتایا گیا ہے کہ جو زندگی کی ظاہری باتوں پر اکتفا کر لیتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ لوگ کائنات اور اس کے نظام سے دو طرح کا فائدہ اٹھائیں۔ ایک تو جسمانی طور پر زیبائش اور آرائش سے اور دوسرا روحانی طور پر انسانی ذات کے لئے ان تخلیقات کی حقیقت کو سمجھ کر جو اللہ کی طرف لے جاتی ہیں اور اللہ کی وحدت اور کبریائی سے اس کی عزت بڑھاتی ہیں اور انہیں اس زندگی سے بڑھ کر زیادہ ترقی یافتہ زندگی کی طرف لے جاتی ہے۔ پڑھئے اور دیکھیں ان لوگوں کا انجام جو صرف ظاہری باتوں پر ہی رک گئے اور ان سے دھوکا کھا گئے۔ اس لئے انہوں نے اپنی قوت ظلم کرنے اور اللہ کے دین سے منہ پھیرنے میں لگا دی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں تباہ کر دیا۔

(۲۰۔۳۰) (للعالمين) زبانوں، رنگوں اور ارض وسماوات کے علم پر زور دیا گیا ہے اور دکھایا ہے کہ جو اس کائنات کا علم رکھتے ہیں وہی اللہ تعالیٰ کو بہتر طریقے سے جانتے اور اس کی بنائی ہوئی اشیاء اور اس کی نشانیوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ لیکن جاہل نہ جانتے ہیں نہ اندازہ کر سکتے ہیں۔ لہذا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مذہبی عالم اس کائنات کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تو کیا ان کے لئے ممکن ہے کہ وہ دوسری

قوموں کو اپنے دین کی فضیلت واضح کر سکیں، جبکہ ان کی اپنی قوم علم کائنات میں بہت پیچھے ہو اور نہ انہوں نے ایسا کچھ کیا کہ حقیقی دین معاشرے میں ظاہر ہو سکے۔ قرآن کریم کو دنیا کے لئے فائدہ مند بتانے کے لئے یہی دلیل کافی ہے کہ وہ یہ بتاتا ہے کہ جو کائنات کے نظام کا علم رکھتے ہیں وہ ان لوگوں کو اپنے تابع کر لیتے ہیں جو نہیں جانتے اور انہیں اپنے زیر اثر لے آتے ہیں۔ ان کے ساتھ جیسا چاہیں سلوک کرتے ہیں اور حقیقی صورت حال اس کی تائید کرتی ہے۔ الزمر آیت نمبر ۹ تک پڑھئے۔

(۳۹) البقرۃ کے آخر میں الربا کو دوبارہ دیکھئے۔ یہاں سباق کے لحاظ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ دولت کو محض جمع کرنے کی خاطر بڑھانا اچھی بات نہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ تزکیہ نفس کرنے کے لئے دولت کو اللہ کی رضا کے لئے ان مختلف کاموں میں لگایا جائے جو امت کے لئے فائدہ مند ہوں۔ پڑھئے التکاثر۔

سورۃ الأحزاب

(۵۰۔۵۲) بات بیویوں کے بارے میں ہو رہی ہے۔ نبی کریم ﷺ کی بیویوں کی ایک سے زیادہ تعداد پابندی لگنے سے پہلے کی تھی اور یہ دعوت دینے کے حالات کے مطابق، ضرورت کے تحت تھی۔ جب وہ حالات نہ رہے تو پابندی لگ گئی۔ دیکھئے النساء۔

(۵۶) (یصلون علی النبی) ان کی طرف آتے ہیں۔ (صلوا علیہ) ان کی طرف ایسے آؤ جیسے آپ کا ان سے تعلق تقاضہ کرتا ہے۔ (وسلموا تسلیما) ان کے احکامات اور تعلیمات کی مخالفت نہ کرو۔ دیکھئے النساء ۶۵۔

سورۃ فاطر

(۲۲) (من فی القبور) اس سے ان لوگوں کے لئے عبرت ہے جو یہ سمجھتے تھے کہ قبروں والے انہیں سنتے ہیں جنہیں وہ پکارتے ہیں۔ شاید لوگ اپنی عقل کا استعمال کر لیں اور اس قرآن پر تدبر کر لیں تاکہ وہ قبروں پر بھروسہ نہ کریں۔

(۲۸) (العلماء) یعنی اس کائنات کا علم رکھنے والے۔ اللہ کے نظام کے بارے میں علم رکھنے کی وجہ سے وہ لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ کو جاننے والے بن جاتے ہیں۔ اس طرح ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے اور اس سے ڈرنے میں شدت آ جاتی ہے۔ دراصل اس آیت میں علم پر زور دیا گیا ہے اور عالموں کی اہمیت اجاگر کی گئی ہے۔

سورۃ الصافات

(۶۔۱۰) الشعراء کے آخر میں ۱۹۳ سے پڑھئے اور الحجر کے شروع سے ۱۸ تک اور الجن ۹ تک اور الملک ۵ تک تاکہ آپ سمجھ لیں کہ وہ علم غیب کا دعوی کرتے تھے اور آسمانی باتوں کے جھوٹے دعوے کرتے ہیں۔ جب القرآن آیا تو اس نے اپنی آیات اور

دلیلوں سے انہیں نشانہ بنایا اور اپنے براہین کے شہابوں سے ان کی گھات میں لگا رہا۔ جس قدر لوگ دین سے دور ہوتے ہیں اتنا ہی وہ دھوکے بازوں کے جھوٹ سے متاثر ہو جاتے ہیں۔

سورۃ غافر

(۳۵) البقرۃ کے شروع میں پڑھیں تا کہ "الطبع علی القلب" (دل پر مہر لگنے) کے معنی جان لیں اور سمجھ لیں کہ گمراہی کی نسبت اللہ کی طرف اس کے نظام اور سنت کی وجہ سے ہے۔ اس کی ہدایت اسی کے لئے ہوتی ہے جو ہدایت لینا چاہتا ہے اور اس کی طرف پیش قدمی کرتا ہے۔

سورۃ فصلت

(۵۳۔۵۴) بتایا ہے کہ کائنات میں اللہ کی سنتیں (طریقہ کار) اجتماعی معاشرے میں یہ واضح کر دیں گی کہ القرآن حق ہے۔ اور یہ اس کے صلاحیت بخش اور ضروری ہونے کی وضاحت ہے کیونکہ یہ ان کے مطابق ہے اور انہیں کی طرف دعوت دیتا ہے۔ دیکھئے النمل کے آخر میں۔

سورۃ الشوری

(۱۰) اس کے معنی ہیں کہ ہر بات کا فیصلہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا جائے گا اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی کتاب میں بیان کردہ شریعت کا علم ہونا چاہئے اور کائنات میں رائج اس کے نظام کا بھی۔ اور جو کوئی بھی اللہ کے احکام نافذ کرنے والا ہو اس کی اطاعت گویا اللہ کی اطاعت ہوگی۔ دیکھئے النساء ۵۹۔

(۲۱) اس آیت میں ان لوگوں کے لئے تنذیر ہے جو دین میں نئے طریقے ایجاد کرتے ہیں اور لوگوں کے لئے ایسے رسم و رواج وجود میں لاتے ہیں جو اللہ کی شریعت کے خلاف ہوتے ہیں۔ اور جو کوئی ایسا کرتا ہے وہ اپنے آپ کو شریعت میں اللہ کا شریک بنا لیتا ہے۔ دیکھئے التوبۃ ۳۱۔

(۲۹) یہ آیت بتاتی ہے کہ آسمانوں میں آبادی ہے۔ دیکھئے المؤمنون ۱۶، فصلت کے شروع میں، الرحمن ۲۹ اور النمل ۴۱۔

اور بتایا ہے کہ آسمان میں رہنے والوں اور زمین میں رہنے والوں کو اکٹھا کرنا ممکن ہے۔ اس سے مواصلاتی نظام اور کائناتی سنتوں کے بارے میں جاننے کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

(۳۸) مومنوں کی یہ صفت بیان کی ہے کہ امورِ مملکت کے بارے میں باہمی مشاورت کرتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جبری حکومت نہ مومنوں کا کام ہے نہ نظام ہے۔

سورۃ الدخان

(۱۰۔۱۱) اسی زمانے میں زہریلی اور گلا گھونٹنے والی گیسیں سامنے آئی ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ وہی واضح دھواں ہے جو لوگوں کو ڈھانپ لیتا ہے اور انہیں المناک عذاب دیتا ہے۔ دیکھئے الانعام ۶۵۔

(رھوا) کھلا ہوا۔ یہ معاملہ سمندر کی جو حالت اس وقت تھی اسے آپ پر واضح کر دیتا ہے۔ الشعراء اور طٰہٰ پڑھئے تاکہ معلوم ہو کہ حضرت موسیٰؑ کو سمندر کے درمیان میں خشک راستہ کھلا ہوا ملا جس سے وہ گزر گئے۔ فرعون اور اس کے سپاہی غرق ہوئے کیونکہ وہ اس کھلے راستے کا پتہ نہ لگا سکے۔

سورۃ الجاثیۃ

(۲۱۔۳۷) اس سے یہ فیصلہ بتایا گیا ہے کہ جزا عمل کی مقدار کے مطابق ہوتی ہے اور عمل لکھے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہوا ہر بات چیت کو محفوظ کرتی ہے اور اس میں تصویروں اور اعمال کا نقشہ بنتا ہے۔ علم نے اس کا انکشاف کیا ہے اور ابھی یہ انکشاف کرنا باقی ہے کہ کس طرح آپ کے نفس پر اس کی کتابت اور تصویر بنتی ہے تاکہ آپ عمل کے بدلے سے متعلق غرض و غایت سمجھ سکیں۔ لہٰذا اس لالچ میں نہ رہیں کہ کوئی آپ کے بوجھ میں سے کچھ اٹھا لے گا یا آپ دوسروں کے اعمال حسنہ کے باعث جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ الاسراء پڑھئے اور النجم اور القمر کے آخر میں پھر الاعراف ۵۱ سے ۵۳ تک پڑھئے۔

سورۃ محمد

(۴) (فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً) یعنی ہمارے پاس قیدیوں کی گرفتاری کے بعد دو ہی راستے ہیں۔ انہیں مہربانی کر کے بغیر کسی معاوضہ کے چھوڑ دیا جائے یا مال کے بدلے یا اگر ہمارے قیدی ان کے پاس ہوں تو ان کے بدلے میں تبادلے کی کوئی اور صورت۔ ان دو باتوں کے علاوہ ہمارے پاس قیدیوں کے لئے کوئی اختیار نہیں۔ اگر وہ رہائی اور آزادی کے بعد ہمارے پاس رہنا چاہیں تو ان کے ساتھ اسی طرح کا عزت اور احترام اور حسن معاملہ روا رکھا جائے جیسا ہمارا آپس میں ہے۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ بغیر شادی کئے ان کی عورتوں سے تمتع کیا جا سکتا ہے، بالکل باطل ہے۔ الانسان اور النساء کو دہرائیے۔

سورۃ الحدید

(۲۲۔۲۳) بتایا گیا ہے کہ دنیا ایک نظام کے تحت چل رہی ہے اور ہر بات کا کوئی نہ کوئی سبب ہے اور جس قدر انسان کا علم ہوتا ہے اسی قدر ان کے حالات حُسنِ انتظام سے چلتے ہیں اور وہ کسی بھی مشکل صورت حال میں پڑنے سے بچتے ہیں۔ اس میں مومنین کے لئے آرام ہے۔ اگر غلطی کرتے ہیں تو مزید احتیاط کرتے ہیں اور کسی محرومی پر مایوس نہیں ہوتے۔ اسی طرح اگر حالات اچھے ہوں اور اللہ اپنی نعمتوں سے نوازے تو مطمئن ہوتے ہیں۔ التغابن پڑھئے۔

(۱۳) (فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ) یعنی اپنی ڈیوٹی پوری کرتے رہیں اور صلاحیت بخش کام جیسے فرائض ادا کرتے رہو۔ اس کے علاوہ آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں۔

سورۃ الممتحنۃ

(لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا) اس کے سیاق سے یہ سمجھایا گیا ہے کہ ہمیں کافروں جیسے عمل کرنے یا ان کی صفات اپنانے سے باز رہنا چاہئے تاکہ یہ ان کے لئے بری مثال نہ بن جائے کہ وہ ہماری تقلید کرلیں یا بھروسہ کرلیں۔ آج کل بہت سے لوگ ایسے ملتے ہیں جو خود کو مسلمان کہلاتے ہیں مگر برے اعمال کرتے ہیں۔ اس طرح غیر مسلم اسے اسلام پر حجت بنا لیتے ہیں اور اس سے راہ فرار اختیار کرتے ہیں اور اہل اسلام کی خرابیوں کی وجہ سے اس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر یہ دین اچھا ہوتا تو اس کے ماننے والے بھی اچھے ہوتے۔ یہ فتنہ یعنی بری مثال ہے۔

(۸۔۹) بتایا ہے کہ یہ ہمارے دین کے اصولوں میں سے ہے کہ تمام غیروں سے حسن سلوک کیا جائے اور مل جل کر رہا جائے، اگر وہ ہمارے دین کی مخالفت میں کھڑے نہ ہوں اور نہ ہمارے وطنوں پر حملہ کریں۔ البتہ جو ہمارے دین یا وطن پر حملہ آور ہوں تو ہم اپنے حق کے دفاع کے لئے ان سے جنگ کریں نہ کہ ان کے دین سے نفرت کی بنا پر نہ اذیت پسندی کی خاطر۔ دیکھئے التوبۃ۔

سورۃ التغابن

(۲) (فمنکم) بتاتا ہے کہ پیدا ہونے کے بعد کفر اور ایمان خود اختیار کیا جاتا ہے اور اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اسطرح پیدا کیا ہے کہ وہ ہر شے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کفر کا انتخاب کرتے ہیں اور کچھ ایمان لاتے ہیں۔ یہ اس کا احسان ہے کہ اس نے انہیں آزادی اور خود مختاری کے ساتھ پیدا کیا ہے کہ جو وہ چاہیں اختیار کرلیں۔ دیکھئے الانسان اور الشمس۔

سورۃ الطلاق

(۱۴)(سبع سمٰوات) سورۃ الملک پڑھئے تاکہ اس تعداد کے معنی جان سکیں۔(مثلھن) بتایا ہے کہ السماء (آسمان) اس میں رہنے والوں کے لئے أرض (زمین) ہوتا ہے اور دوسرے کروں کے مکینوں کے لئے سماء ۔اس طرح جتنی تعداد زمینوں (أرض) کی ہوگی اتنی ہی آسمانوں (سمٰوات) کی۔(ینزل الامر بینھن) یہ ظاہر کرتا ہے کہ آسمانوں میں کئی جہاں آباد ہیں جو عمل کرنے کے پابند ہیں۔ الصافات کے شروع سے دوبارہ دیکھئے۔

(یہ آخری قسط ہے۔اس کے بعد کی سورتوں میں زیادہ تر حوالہ جات ہیں جن کی تشریح پہلے آچکی ہے۔)

عرضِ مترجم:

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو کوئی بھی قرآن کریم کو روایات کے بغیر تصریف الآیات کے ذریعے سمجھے گا وہ تقریباً ایک ہی نتیجے پر پہنچے گا۔اگر اختلافی بات نظر آتی ہے تو اس کی وجہ اس زمانے کے علم کے لحاظ سے جو انکشافات ابھی نہیں ہوئے ہوتے وہ ان سے متعلق ہوتی ہے۔اور وہ جنہیں اسلامی مملکت کی مجلسِ شوریٰ نے طے کرنا ہے۔

یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ قرآن کریم ایک فلاحی مملکت کا نظام دیتا ہے جس میں کسی قسم کی طبقاتی، لسانی یا نسلی تفریق نہ ہو۔محض چند رسوم کو اسلام قرار دینا ظلم ہے۔

اگر اس بات کو اصولی طور پر سمجھ لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنے قوانین میں تبدیلی نہیں کرتا (جیسا کہ قرآن کریم میں کئی مقام پر ذکر ہے) تو پھر ان معجزات کا کوئی وجہ جواز نہیں بنتا جو انبیاء کرامؑ سے منسوب ہیں۔

آخری بات یہ کہ جو کوئی بھی صرف قرآن کریم پیش کرتا ہے، اسے مذہبی لیڈروں کی طرف سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ لوگ علامہ پرویز کے نام سے چڑ جاتے ہیں، انہیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ مخالفت شخصیات کی نہیں قرآن کریم کی ہوتی ہے لیکن چونکہ وہ اللہ کی کتاب کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے اس لئے وہ شخصیات کو نشانہ بناتے ہیں۔قرآن کریم میں اس طرح کی مخالفت کا متعدد مقامات پر ذکر ہے۔

☆.....☆.....☆

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں

پرچہ پریس جا چکا تھا کہ اطلاع ملی ڈاکٹر صلاح الدین اکبر بھی انتقال فرما گئے۔قیامِ پاکستان سے قبل K.ED سے ایم بی بی ایس کر لیا تھا۔بعد از قیامِ پاکستان مہاجرین کے کیمپ لاہور میں اپنی خدمات کا سلسلہ شروع کیا جو کہ آخر دم تک قائم رہا متعدد ناول اور افسانوں کے مجموعے شائع ہوئے۔پرویز صاحب سے متعارف ہونے کے بعد ماہنامہ طلوع اسلام میں مضامین لکھتے رہے اور ہفتہ وار درسِ قرآن میں بلا ناغہ شریک ہوتے رہے۔دُعا ہے کہ اللہ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل سے نوازے۔ادارہ مرحوم کے بیٹوں، بیٹی اور دیگر اہل خانہ اعزہ واقرباء کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

گاہے گاہے باز خوان

تاریخ پاکستان کے گم گشتہ حقائق

حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمتہ کی وفات پر

کیا خبر تھی کہ ''طلوعِ اسلام''۔ جس اسلامی مفکر کے فلسفۂ حیات کا صور پھونکنے' اور مسلمانوں کو صحیح اسلام سے روشناس کرانے کے لیے میدان میں نکلنے والا ہے' وہ علم و عرفان کی دُنیا کو یتیم اور غمزدہ چھوڑ کر خدائے کون و مکان کی لقاء کے لیے بے تاب بیٹھا ہے اور مادی قباء کو تن نورانی سے اُتار پھینکنے پر تلا ہوا ہے! سچ یہ ہے کہ علامہ محمد اقبالؒ مرحوم و مغفور کو فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ لَاٰتٍ کی لَے اتنی پیاری لگی کہ پیاسی دُنیا کو سیراب کرنے کا خیال ہی نہ رہا اور شیفتگی اور وارفتگی کے عالم میں اتنے تیز قدم اُٹھائے کہ علم و فکر کی آبادی اس نقیبِ زندگی کو دیکھتی کی دیکھتی ہی رہ گئی۔

مرحوم کو خیال ہی نہ رہا کہ فطرت کی بخشائشیں کن اُمور کی منتظر ہیں اور علم و حکمت کو بھی اُن کی کس قدر ضرورت ہے۔ حقیقت میں یہ عاشق رسول' یہ حکیمِ اسلام۔ یہ علم و معرفت کا بحرِ تلزم اور اسلام کا یہ بے مثال فلسفی مَنْ کَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰہِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ لَاٰتٍ (29:5) کی صبر شکن صدا کو سنکر کب تک صبر کرتا؟ اُس نے غیب سے یہ صدا سنی' لبیک کہا اور علم و حکمت کو روتا ہوا چھوڑ کر اور خود مسکراتا ہوا اپنے محبوب کے پاس چلدیا!

☆ ..... ☆ ..... ☆

مرحوم نے اپنے غریب خانہ پر 21 اپریل 1938ء کی صبح 5 1/2 بجے انتقال فرمایا اور جس خوف سے ساری عمر مسلمانوں کو بے خوف کرتے رہے اُسے یہ کہہ کر:۔

''میں مسلمان ہوں اس لیے خوشی سے موت کا استقبال کرتا ہوں''۔

موت سے بغلگیر ہو گئے اور اپنے آخری وقت میں بھی دُنیا کو اسلام کی تفسیر بتادی!

آپ کی وفات سے نہ صرف مشرق کی تابندہ و پائندہ شاعری کو نقصان پہنچا ہے۔ نہ صرف علم و حکمت کی دُنیا یتیم ہوگئی ہے نہ صرف اجتماعی زندگی کی شمع گل ہوئی ہے بلکہ انسانی ضمیر کا وہ احساس گم ہو گیا ہے جو وحدتِ انسانی کی بنیاد' رجائیت و عمل کی اساس اور فکر و حیات کا سرچشمہ تھا۔

مرحوم و مغفور اقبالؒ نہیں نہیں عزائم و خودداری کے پیکرِ نورانی' اُردو شاعری کے باعث ہندوستان میں اَور فارسی کلام کے باعث دُنیا کے گوشہ گوشہ میں متعارف ہیں اور ہر شخص اُن کے خیالات و نظریات سے اُن کے کاملاتِ علمی کا اندازہ لگا

سکتا ہے اور گو انہوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ لاہور میں گزارا اور ہندوستان میں رہ کر ہندوستانی کہلائے، مگر حقیقت میں وہ کسی ایک ملک کسی ایک قوم اور کسی ایک دَور کی شخصیت اور ملکیت نہ تھے بلکہ وہ دَورِ حاضرہ کی انسانیت کی امانت تھے وہ حکیم تھے، اُن کی تشخیص درست تھی اور بیماری کے اسباب کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور انہوں نے انسان کی مصیبتوں کا جو علاج تجویز کیا تھا اُس کی بنیاد بھی انسانیت اور ضمیر کی آواز تھی۔

☆.....☆.....☆

اقبالؔ کا خزانہ علم وحکمت عام ہے۔ دُنیا تیس سال سے اُن کے موتیوں سے اپنے دامن بھرتی رہی ہے اور خدا جانے، کتنی سعید روحیں ہیں جنہوں نے اقبالؔ کے پیام کو سنا اور ان کے نظریات اسلام کے اس سانچہ میں ڈھل گئے جس سے بہتر فطرت نے کوئی دوسرا سانچہ تیار نہیں کیا ہے گو شاعری کا اعلیٰ سے اعلیٰ تصور اور بہتر سے بہتر تخیل بھی مرحوم کے مخصوص علمِ کلام کا آئینہ دار نہیں ہوسکتا تاہم ان کی بے مثال شاعری نے جس طرح اسلامی ضمیر کی تشکیل کی ہے، اور موجودہ مذہبی اور سیاسی ماحول میں اسلام کے فلسفہ کو جس بلندی پر پہنچایا ہے اس کی مثال موجودہ صدی میں ملنی محال ہے۔

اقبالؔ، ہمیشہ مذہبی بنیادوں پر مسلمانوں کے حقوق کے علمبردار رہے۔ ان کا ایمان تھا کہ جب تک مسلمان دورِ اوّل کی زندگی کو اختیار نہیں کرینگے اور کتاب وسنت کو اپنے عمل وفکر کی بنیاد قرار نہیں دینگے اس وقت تک ان کو نہ مغرب پرستی تباہی سے بچا سکتی ہے اور نہ یورپ زدگی ان کے درد کی دوا ہوسکتی ہے۔ چنانچہ وہ ساری عمر اسی فلسفۂ حیات کا درس دیتے رہے اور یہی سرچشمہ ان کو مسلم کی زندگی میں نظر آتا رہا۔ اِسی لیے وہ مسلم بن کر جئے۔ مسلم بن کر میدان میں آئے اور مسلم بن کر واصلِ بحق ہوئے اُن کے نزدیک زندگی کا راز، فلسفۂ حیات کا نکتہ، اور عظمت وکامرانی کا جوہر کتابِ الٰہی کے صرف اس ٹکڑا میں پوشیدہ تھا۔

رَبِّ ..... تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ

اے پروردگار! مجھے مسلم بنا کر اُٹھا اور صالحین کی معیت نصیب کر!

☆.....☆.....☆

مرحوم کا دائرۂ خدمت سب سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر تھا۔ انہوں نے دُنیا کو اجتماعی زندگی کا درس عمل دیا۔ رجائیت اور خودداری پر اپنے فلسفہ کی بنیاد رکھی، زندگی کے جذبات میں تلاطم پیدا کیا، دماغوں کو رفعت اور بلندی بخشی، قوم کی ذہنیت اور مزاج میں ایسا انقلاب پیدا کیا جو آئندہ ایک عرصہ تک ہر اصلاحی تحریک میں بنیادی عنصر کا کام دیتا رہے گا۔

اقبال کا عقیدہ تھا، اور کون اسلام کا عارف اور حکیم ہے جو اس کا قائل نہ ہو، کہ اسلام میں اتنی وسعت، اتنی ہمہ گیری اور اتنی صلاحیت موجود ہے کہ جو قوم اپنے نظامِ حیات کو قرآن حکیم کے سپرد کردے گی قرآن زندگی کے قدم قدم پر اس کی

رہنمائی کرے گا اور قوم کا مزاج عقلی اِس سے تقویم پاتا رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مرحوم زندگی کے کسی نظام سے مطمئن نہ تھے اور دنیا کی کوئی غلط تحریک اُن کے دماغ کو متاثر نہ کر سکی۔ اُن کے نزدیک زِندگی کا مکمل نظام اور ضابطہ حیات صرف اسلام ہے اور بلاشبہ جو شخص بھی مرحوم کی سی گہری نظر رکھے گا وہ ہزار ٹھوکریں کھانے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچے گا۔

☆.....☆.....☆

مثل مشہور ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی قدر ہوتی ہے مگر مرحوم اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں آپ کو اپنی زِندگی میں رفعت وعظمت کا وہ بلند مقام حاصل ہوا جو صرف آپ ہی کے لیے مقدر تھا۔ آپ کا کلام نہ صرف انگریزی میں بلکہ یورپ کی دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا گیا اور اس سے مغرب کے دانش فروشوں نے' انسانیت' عزم' خودداری اور رجائیت کے سبق سیکھے۔ اگرچہ مغرب کو معلوم تھا کہ اقبال مغرب کے مادی رُجحانات کے سخت مخالف ہیں اور وہ اسلام کے عملی نظریہ کے مطابق روحانیت اور مادیت کا صحیح امتزاج چاہتے ہیں تاہم اُن کے فلسفہ حیات کی تشریح نے مغربی مفکرین کے فکر ونظر کو جلا بخشی اور اُن کو کلام اقبال کے صدقہ میں زندگی کا راز معلوم ہوا۔

اقبال کبھی اپنی زندگی میں کسی سے مرعوب نہیں ہوئے' پان اسلامزم کے خلاف فرانس کا پروپیگنڈہ آپ کے اسلامی جسم میں وحدۃ اسلامی کی نئی اور تازہ روح پھونک دیتا ہے۔ وطنیت اور قومیت کا وہ فرنگی تصور جس نے اسلامی ممالک کے بڑے بڑے اسلامی مفکرین تک کو اپنے چنگل میں پھنسا لیا ہے وہ اس سے ذرّہ برابر بھی متاثر نہ ہوئے' بلکہ ساری عمران بتوں کو توڑنے میں گزاری۔ یہاں تک کہ یہ مردِ مسلم یورپ کا سفر کرتا ہے اور وہاں سے اسلامی حرارت لے کر واپس ہوتا ہے حالانکہ یورپ ہی وہ مقام ہے جہاں جا کر بڑے سے بڑے متقی کا قلب ودماغ کمزور ہو جایا کرتا ہے' مگر اقبال اس امتحان میں بھی ثابت قدم رہتا ہے اور یورپ کے طواف سے اس کا اسلامی دماغ اور پختہ ہو جاتا ہے۔

☆.....☆.....☆

غرض علامہ اقبال مرحوم ومغفور اقوام مشرق کے لیے اپنے کلام میں فکر وحیات کی وہ آگ سلگتی چھوڑ گئے ہیں جس سے قومیں زندگی اور قوت کی حرارت حاصل کرتی رہیں گی۔ کیونکہ وہ ایک معلم ومفکر ہی نہ تھے' بلکہ انسانی ضمیر کے محرک بھی تھے اور ہمارا ایمان ہے کہ جب تک علم وحکمت باقی رہے گا جب تک انسانیت کے احترام کا جذبہ سینوں سے اُبلتا رہے گا جب تک ملوکیت اور حکمرانی کی اصلاحی تحریکیں جاری رہیں گی اس وقت تک اس حکیمِ اسلام اور مصلحِ اعظم کی یاد بھی تازہ رہے گی!

بقول اخبار ''اسٹیٹس مین'' اقبال کے فقدان سے ہم فقیر ہو گئے ہیں مگر ان کے زندہ کلام نے ہم کو اس قدر غنی کر دیا ہے کہ ہم ہمیشہ دارائی اور سکندری کرتے رہیں گے۔

اے خدا مرحوم کو اپنی رحمتوں سے نواز دے اور اپنے بندوں کے اس محبوب بندہ کو اپنی محبوبیت اور مغفرت کی چادر میں ڈھانک لے اور جملہ منتسبین کے قلب حزین پر صبرِ جمیل کا القاء فرما آمین۔

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے (اقبالؒ)

(ماہنامہ طلوع اسلام اشاعت جون 1938ء)

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزم طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-	سورہ یٰسین	(36)	164	150/-
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	----	سورہ الصّٰفّٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورۃ الکہف و سورہ مریم	(18-19)	532	400/-	سورۃ مومن، حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ الحج	(22)	380	350/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-
سورۃ النور	(24)	264	350/-				
سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-				

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ) 25/B، گلبرگ 2، لاہور، فون نمبر: 4546 3571-42-92+

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

طلوعِ اسلام

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا، گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی
اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل!
''نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی''
تڑپ صحنِ چمن میں، آشیاں میں، شاخساروں میں
جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیر سیمابی
وہ چشم پاک بیں کیوں زینتِ برگستواں دیکھے
نظر آتی ہے جس کو مردِ غازی کی جگر تابی
ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرّے ذرّے کو شہیدِ جستجو کر دے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

ہو اگر خودنگر و خودگر و خودگیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

فکرِ قرآنی کے دیرینہ ساتھی اور بزم طلوع اسلام کوئٹہ کے بنیادی رُکن اور نمائندہ ڈاکٹر غلام صابر (صابر ہومیو فارمیسی) مورخہ 17-9-2014 کی صبح کو وفات پا گئے ہیں۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور پس ماندگان و اہل خانہ و اعزہ و اقرباء کو صبر جمیل سے نوازے۔ ادارہ مرحوم و مغفور کے بیٹوں ڈاکٹر طاہر خلیل و ڈاکٹر عابد صاحب' ان کے اہل خانہ اور بزم کوئٹہ کے تمام دوستوں کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

☆.....☆.....☆

بوریوالہ سے فکرِ قرآنی کے دیرینہ متمسکین میں سے' صوفی محمد انور صاحب 5 ستمبر کو لاہور میں وفات پا گئے۔ بزمِ بوریوالا میں جب درسِ قرآن ہوتا تو مرحوم سب سے پہلے تشریف لاتے اور درسِ قرآن ختم ہونے کے بعد سب سے آخر میں جاتے۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ ادارہ اُن کے فرزند ارجمند محمد عاشق صاحب اور ان کے دیگر بھائیوں' اہل خانہ اور تمام اعزہ و اقرباء کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

☆.....☆.....☆

نہایت دُکھ کے ساتھ یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ بزم طلوع اسلام گوجرانوالہ کے نمائندہ تسنیم شوکت مورخہ 3 ستمبر کو تاحال نامعلوم وجوہ کی بنا پر قتل کر دیے گئے۔ مرحوم و مغفور نہایت مرنجاں مرنج اور انسان دوست شخصیت تھے اور اسی وجہ سے ''صوفی'' کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ اُن کے والد گرامی بھی تاحیات گوجرانوالہ بزم کے نمائندہ رہے اور اب مرحوم تسنیم شوکت یہ ذمہ داریاں احسن طریق سے نبھا رہے تھے۔ ان کے قتل کا مقدمہ مقامی تھانہ میں ان کے بھائی وسیم شوکت صاحب کی مدعیت میں درج کرا دیا گیا ہے۔ مرحوم کی دو بیٹیاں اور ایک بیوہ سوگوار پس ماندگان میں ہیں۔
دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پس ماندگان اہلِ خانہ و اعزہ و اقرباء کو صبرِ جمیل سے نوازے۔ اور اس قتلِ ناحق کے مرتکب کو کیفر کردار تک پہنچائے۔ ادارہ مرحوم کے اہلِ خانہ' ان کے بھائی' احبابِ بزم اور دیگر اعزہ و اقرباء کے دُکھ میں برابر کا شریک ہے۔

☆.....☆.....☆

بزمِ طلوع اسلام کراچی (صدر) کے بنیادی رُکن محترم محمد مختار صاحب مورخہ 13 ستمبر کو انتقال فرما گئے ہیں۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبرِ جمیل سے نوازے۔ ادارہ مرحوم کے فرزند ارجمند محترم وقار صاحب اور ان کے نواسے محترم نبیل صاحب اور دیگر اعزہ و اقرباء اور احباب بزمِ کراچی کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

☆.....☆.....☆

محترمی ومکرمی محمد اکرم راٹھور صاحب

چیئرمین ادارہ طلوعِ اسلام لاہور

السلام علیکم

افسوس اور رنج کے ساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ بزم طلوع اسلام صدر کراچی کے بنیادی رکن جناب محمد مختار صاحب مورخہ 13 ستمبر کو انتقال فرما گئے ہیں۔ آپ نے طویل علالت کے بعد 88 برس کی عمر میں طبعی عمر مکمل کی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ محمد مختار صاحب کا اُن احباب کی صف میں شمار ہوتا ہے جنہوں نے بزم طلوعِ اسلام صدر کراچی کی تشکیل اور قیام کے سلسلہ میں ان تھک کوشش کی تھی۔ جناب محمد مختار صاحب نے نہایت فراخدلی کے ساتھ بزم ھذا کی مالی معاونت فرمائی۔ جب بھی اور جیسا بھی کوئی مسئلہ درپیش آیا تو بزم ھذا کی مالی معاونت کے لئے جناب محمد مختار صاحب اور جناب یوسف علی ضیاء خان جی (مرحوم) نے آگے بڑھ کر اُسے حل کر دیا۔

جناب مختار صاحب اپنی ذات میں ایک بزم تھے۔ ٹرسٹ کی شائع کردہ کتب اور شمارہ طلوعِ اسلام اپنی گرہ سے خرید کر بزم سے باہر کے احباب کو بلا قیمت دیتے تھے۔ ہر برس رمضان کے مہینے میں مفہوم القرآن ایک بڑی تعداد میں خرید کر درس پر آنے والے احباب کو تحفتہً دیا کرتے تھے۔ نہ صرف کراچی بلکہ گوجرانوالہ، راولپنڈی، ملتان، لاڑکانہ، دبئی، کینیڈا اور امریکہ و آسٹریلیا اپنے خاندان کے لوگوں کو طلوع اسلام کا لٹریچر بھجواتے تھے۔ اس کے علاوہ نئی نسل کے ساتھ خط و کتابت کرتے تھے۔ کراچی سے شائع ہونے والے بڑے بڑے اخبارات پر نظر رکھتے تھے۔ جہاں بھی ضرورت سمجھتے ان کو خطوط لکھتے کہ قرآن اس سلسلہ میں نوعِ انسان کی یوں راہنمائی کرتا ہے۔ یہاں شائع ہونے والے دیگر مذہبی قسم کے جریدوں میں مضامین لکھتے رہے۔ کراچی میں بعض پبلشرز کی لائبریریوں میں طلوعِ اسلام کا لٹریچر بطور گفٹ دیتے تھے۔

آپ صوم وصلوٰۃ کے سختی سے پابند تھے۔ اس طرح گول مارکیٹ ناظم آباد کراچی کی ایک جامع مسجد میں جناب مختار صاحب کا ایک وسیع حلقہ احباب تھا۔ راقم عینی شاہد ہے کہ کراچی کے علاوہ حیدر آباد، ملتان، گوجرانوالہ اور راولپنڈی سے تعلق رکھنے والے بعض اہل علم و دانش کو سال میں دو بار مدعو کرتے تھے اور ان کے وسیع و عریض مکان میں فکر قرآن پر خوب Debate ہوتی تھی۔ آپ ایک علم دوست اور قرآن کے شیدائی اور طالب علم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں نہایت صالح اولاد سے نوازا ہے۔ ان کا فرزند وقار اور نواسہ نبیل، طلوع اسلام کے احباب کو حد درجہ عزت اور احترام دیتے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے بھائی محمد مختار صاحب کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ ہم سب ان کے لواحقین کے غم میں شریک ہیں۔

بزمِ طلوع اسلام صدر کراچی

☆.....☆.....☆

Surah *Al-Mursalaat* (المرسلات) – Durus-al-Qur'an Parah 29: Chapter 29

By G. A. Parwez

(Translated by: Dr. Mansoor Alam)

My dear friends, today is May 4, 1984 and today's lecture starts with verse (77:20) of Surah *Al-Mursalaat* (المرسلات).

Special characteristic of the last parts of the Quran

Although the struggle from the very beginning of the Prophet's mission was between truth (حق) and falsehood (باطل), it greatly intensified and reached its final phase towards the end of his life; and that is what the Quran has described in its last parts. The entire point of it could be summed up in Allah's *Law of Requital*; and therefore, it is really important to understand this law. Oppressed people want to see their oppressors punished quickly, and, since the punishment does not come quickly they get disappointed or even disconcerted about Islam's sense of justice. Since oppressors continue to flourish and they see that no one is there to hold them accountable, they continue their oppression and tyranny unabated with greater intensity.

The mistake of oppressors and the oppressed

My dear friends, there is a *period of respite* built into the *Law of Requital*. This is an interval between the action and its result. This has been a constant theme in almost all the lectures. It is purely a mercy and grace of Allah that He has bestowed this period of respite on to humans. Because, without it no human can survive as no one is perfect. But both these groups – the oppressors and the oppressed – remain under false impression and start thinking that there is no such thing as the Law of Requital. The oppressed because they think that the oppressor continues to oppress and nothing is being done to him. At first, doubt and suspicion may arise in their hearts; then maybe disappointment and hopelessness will set in, which then might lead them to disbelieve in this law. On the other side is the oppressor who hears sermons that

oppression results in destruction and ruin; that Allah will punish oppressors. But the oppressor sees that nothing is happening to him; that, instead of being punished, he continues to prosper. So, he becomes even bolder and more ruthless in his oppression and tyranny. This goes on. However, Allah does not change His law of requital for anyone's emotional expediency or wishful thinking. The Quran explains why a determined period of respite has been kept into the law of requital. It invites people to observe nature and learn from the events in the external Universe as to why there is a certain delay between action and its result. But many ask for hurry as we saw in the previous lectures, where the opponents of the Prophet (PBUH) demanded why the promised destruction was not coming soon. This point is further explained in the next verse through an example of pregnancy and baby's birth.

A concrete example of pregnancy and baby's birth

My dear friends, the Quran commonly gives the example of pregnancy and baby's birth to explain the period of respite – it takes normally nine months from conception to normal birth. There is possibility of danger in case one hastens this period; so, it says, you do not insist on it. This, you do understand. But when we say that, similarly, there is a determined period of respite between an evil (unjust) deed and its result, then why don't you understand?

This is the reason it is said here: (77:20-22) اَلَمۡ نَخۡلُقۡكُّمۡ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِيۡنٍ ۙ فَجَعَلۡنٰهُ فِىۡ قَرَارٍ مَّكِيۡنٍ ۙ اِلٰى قَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ - Did We not create you out of a humble fluid which We then let it remain firm in a resting place for a term measured? Don't you ponder on this whole process? The semen drops in the womb which has millions of sperms. But look at the two words "قَرَارٍ مَّكِيۡنٍ" the Quran has used and please ask the scientists of today: Who could have, other than Allah, enumerated all the stages of human reproduction more than1400 years ago – from conception to child birth? Medical science has shown that the semen does not directly get dropped in the womb. Actually, there are millions of sperms in a drop of semen. Sperms travel through the vagina and cervix into the uterus for fertilization of the ovum. Upon fertilization and implantation, gestation of the fetus then occurs within the female's uterus. Dear friends, the details will be long and this is not my field. But this is what happens as given in the Quran and confirmed

by the scientists. I do not like to move forward when the words of the Quran are in front of me. The Quran says here "قرار". When something is moving and stops at some place then only it is called "قرار". This, no one could have understood at that time when the Quran was being revealed that these tiny sperms physically move; and when a sperm fertilizes an egg then it stops moving (قرار); and then finds its resting place (مکین) thus making it in the words of the Quran " قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ". The Western scientists become speechless and rapturous when they ponder on these verses of the Quran. The question of how long it would remain there in the قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ? The answer: اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (77:22) — for a period that is known and determined. The word قدَر of the Quran is a very comprehensive word. This is a measure that Allah has decided. In our terminology we call it law, i.e., the measure as determined by Allah; and this is known. *This* is the period of respite and is only due to this that a child is born wholesome and healthy.

The period respite – the Quran has referred to it as a measure

My dear friends, after this the Quran says: فَقَدَرْنَا ۟ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ (77:23) – Thus have We determined the measure for everything: and excellent indeed is Our power to determine this measure! Thus We have kept a period of respite between an action and its result. And Allah has given a concrete example to explain this. After this example Allah has proclaimed His fundamental principle; his basic law: فَقَدَرْنَا – We have decided a measure for everything; a law for everything; a period of respite for everything. Further, he said: How excellent We are in making these measures; in making these laws; and how excellent are these laws! Scientists and physicians can attest to this fact: — how these laws and measures turn out to be so merciful and beneficial to humanity?! This principle of universal mercy of respite (or measure or law) is embedded in everything. That is how the Universe and everything in it is working.

The test for truth and falsehood

My dear friends, the Quran then turns to laws of nature. As I had mentioned this in passing in the last lecture that conquering the forces of nature is truth (حق) and being helpless at their mercy is falsehood (باطل). This is also a struggle between truth (حق)

and falsehood (باطل). But this requires some explanation. As such these are the last parts of the Quran, and also because there is no guarantee for life; so, let me shed some light on this of what I know from the Quran: These laws of nature *are* laws of Allah. These *are* Divine laws. These are not someone else's laws. So, when you mention the laws of Allah then these laws of nature must come first. When we are asked to obey (the laws of) Allah then how can we exclude these laws? In fact, these laws (of nature) are the ones that should come first. This requires further explanation.

To conquer the forces of nature is one part of the *Deen*

My dear friends, these laws of nature were not given by revelation but humans can discover them by research. As human knowledge keeps increasing, the covers on these laws will continue to be lifted up. By research these laws could be conquered and their power harnessed. And humans can become masters of these laws within the Cosmos. By making use of these laws humans have derived so many benefits: they have created so much comforts of life; they have made so much material progress; and created so many extraordinary technological marvels that they hardly require any mention. These are the rewards of conquering the forces of nature using the laws of Allah pertaining to the Cosmos. But only those nations will derive these benefits in this world – آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً – that actually conquer the forces of nature. You can notice that nations who do not conquer the forces of nature are dominated by those which do. These nations are always dependent on others – even for their basic needs of life they are dependent on nations who have conquered the forces of nature. So, you can see how important this aspect of the *Deen* is? The Quran has proclaimed that conquering the forces of nature is part the *Deen* of Allah. It says: أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ (3:83) – Do they seek a دِين (*Deen*) other than the *Deen* of Allah? Are they in search of any other system of life (*Deen*)? Do they seek any other god besides Allah?

Everything in the Universe is obeying the laws of Allah

My dear friends, in verse (3:83) the Quran calls it دِين اللّٰہِ and says that it is a fact that: وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ (3:83) – whatever is in the Universe surrenders itself to the laws of Allah, willingly or unwillingly, since unto His laws all must return? So, to surrender unto the laws of Allah, to act according to these laws, to

lead life according to these laws – *this* is *Deen* of Allah. And everything in the Universe is obeying this *Deen* of Allah: وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (3:83). This is the *Deen* of Allah about which the Quran says: do they want some other *Deen* against it? وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (3:85) – For, if one goes in search of a *Deen* other than the *Deen* of Islam, it will never be accepted.

This part of *Deen* pertaining to the Cosmos is working beautifully

My dear friends, the Quran is *the Deen* of Allah. The Universe and everything in it is incessantly obeying the laws (*Deen*) of Allah. They do not have the freedom to disobey these laws (*Deen*) of Allah. This *Deen* of Allah is working perfectly in the entire Universe. The Quran tells humans to do research, to acquire knowledge, to uncover these laws that govern everything in the Universe; and it asks humans to conquer the forces behind them.

Humans cannot interfere in these laws of nature

My dear friends! Allah has made these laws (of nature) such that human beings cannot interfere with their workings. That is why they keep on producing the correct outcome all the time according to their laws. If you are thirsty and if you do not drink water in violation of the laws of Allah (nature) you will feel the pain of thirst. This pain will become unbearable after a while. This is due to the violation of the law of Allah pertaining to thirst. You will have to return to this law if you want to survive by drinking water: وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ . The same thing applies to hunger. So, violating the physical laws of nature, results in punishment very soon.

Violating physical laws of nature brings destruction

My dear friends, when one returns to these laws one gets its benefits. If not, then one suffers the consequences. This is at individual level. But this is also the case at national level. For example, the people of Noah got drowned in the flood. Why this happened?—they did not follow the law of Allah to be saved from flood: Those who did were saved by building a boat. Those who didn't were drowned. The same law is applicable today as it was applicable at the time of Noah. No doubt, there is always a period of respite before the destruction hits.

There is only one way to be superpower

My dear friends, I have mentioned this briefly. But the message is very clear: violation of the physical laws does have an effect but it has a built-in period of respite for recovery. Period of respite varies depending on which laws are violated. But the results do appear for sure according to the law, because humans cannot interfere in these laws and change their outcome. It never happens that one commits the violation of the laws of nature and someone else suffers the consequence. This is the law of requital – for every action there is a consequence and it is determined: فَقَدَرْنَا ۟ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ (77:23) – Thus have We determined the measure: and excellent indeed is Our power to determine. And these measures or these laws are unalterable. There is no changing of the result. Therefore, it is necessary for humans to try to acquire knowledge of the forces of nature and its laws; and nations that do this become superpowers. What makes them superpowers? The forces of nature! Those nations that conquer them become superpowers and keep advancing in the world. And other nations become dependent on them; become subservient to them; become deprived; become beggars; and lead their lives in fear and anxiety. Why? They didn't follow the *Deen* of Allah, i.e., the laws of Allah that pertain to the physical Universe.

My dear friends, I sense the question that may be bothering you: that the nations who have acquired the status of superpowers are all infidels? But we are infidels too – for this part of Allah's *Deen* that requires conquering the forces of nature. And because of that we are living a life of hell in this world. By abandoning this part of the *Deen* of Allah how can we expect the results to be otherwise? By practicing the five pillars we think we are done. Yes, they are necessary; but conquering the forces of nature is also necessary part of the *Deen* of Allah.

There is no court, no lobbying, or no favor in the entire Universe

My dear friends, no one can interfere in the part of the laws of Allah pertaining to the external Universe. There are no courts; no juries; and no lobbying in this part of His laws. This is an impeccable system of justice, and humans cannot interfere in the rendering of justice. It will never happen that cyanide becomes honey. But between the action and the result there is a built-in period of respite that provides opportunity

for recovery by returning to the laws that provide remedy. That is called توبہ – i.e., returning to the laws of Allah. Nations that have done research have found out the remedies for many diseases. If humans died suddenly for any mistake or for any violation of the laws of nature then no humans can survive on this planet. The period of respite built into the violation serves to provide an opportunity for remedy.

Life's second aspect – the human life as opposed to physical life

My dear friends! We see that the justice system of the external Universe works incessantly in perfect way and humans cannot interfere in this. Destructions happen; calamities visit; good times come; nations progress – all these are results of leading life by violating or following the laws of nature. There is period of respite for remedy and correction by returning to the laws: وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ . The Quran explains all these things. It gives practical examples of the period of respite. Next comes the human part of the human life which includes his physical or the material life. As far as the physical life is concerned, there is no difference between humans and animals in terms of the laws of nature. The same laws apply to both.

The cure after centuries of destructions and bloodsheds – the guidance of revelation

My dear friends, there is another life – that is related to human life of humans. This is the life in which humans have to deal with problems with each other – not related to the human body but related to humankind. One understands that death will occur when one ingests cyanide. There is also an antidote for its remedy during the period of respite. The question is: What kind of death occurs when one lies; when one cheats; when one deceives? Research has produced neither any answer nor any laws for this. These laws can only be known through revelation. This is the second kind of mercy of Allah: He has given these laws though revelation. Even for physical diseases, who knows how many centuries it has taken for humans to find a medicine for a disease? Finding medicines to cure diseases is a great mercy but it takes many hurdles, long struggles, and untold miseries to have any results. Who knew the poison from snakes could save lives? How many people would have lost their lives to find this out? But this was a pure Grace from Allah that He gave His revelation

through messengers directly to guide humanity without going through any difficult and long trial and error process as it is the case with the physical aspect of humankind.

Division of humans by humans

My dear friends, now comes the second part of the *Deen*, which deals with human aspects of humankind. There are those who kept on following the first part that deals with the external Universe (which includes the physical aspects of humankind) and they ignored the second part, the human aspects. Anyway, they at least acquired the benefits pertaining to the material world. The second category is of those – that is, our category – who despise the material world. The word "materialistic" started to be used for irreligious people. Sufism entered Islam. Its teaching is same as the Hindu philosophy of Vedanta, which is, that human soul is part of God's soul that got separated and trapped in the sinful material body. And it yearns to join its original source. For this it goes through millions of cycles of transmigration and eventually joins its original source. And thus it becomes as it was at the beginning. Imagine, after all this effort it becomes as it was originally before it got separated. My dear friends, this is Sufism. This is Vedanta. And this is Christian Mysticism.

The world of mysticism and the result of disobeying the *Deen* of Allah

My dear friends, please read the life of their saints. The biggest achievement of this saint? He did not take bath his entire life! Another saint? He used to eat together with his son! Ok! At least he ate. But another one? He didn't eat at all. And this one? He never got rid of the lice in his hair. They despised the material world so much!! This was there concept of being closer to God. They avoided the *Deen* of Allah to such an extent? They showed so much animosity and transgression against the material world? This is also the case with mysticism in Islam. You will read that so and so left the family and the material world and vanished somewhere; that so and so used to hang himself in a well upside down and pecked on a bread made of wood? Amazing!! This is called renouncing the world. All the stories of the great Sufis in Islam abound with how they renounced the world? Think about it my friends! If this is not transgression against the *Deen* of Allah then what is? So much hatred against it?!

My dear friends, the negative result of this Sufism is borne by later generations. And when the proponents of Sharia saw that the sign of closeness to God is in renouncing the material world then they also inserted in the books of Hadith narrations such as: the world is prison; that a believer lives in the world as if it is a prison and he is a prisoner; that the world is a corpse and those who go after it are dogs: – The same hatred for the world as in Sufism and in mysticism. The same rejection of that part of the *Deen* of Allah, that deals with the external world. The result is in front of us. Our continuous punishment is in front us – for thousands of years. Read the history. You will see that all nations that despised the material world and had such a negative view of it – they are all suffering the consequences for thousands of years until today.

Balance between the material and the human world *is* called Islam

My dear friends, I have emphasized that conquering the forces of nature is just one part of the *Deen* of Islam. The second part of the *Deen* deals with humankind and its guidance: the part that is not related to human body but with human affairs and society – its problems and its solution. This is the part that needs guidance of Allah's revelation. By combining the two parts we get the complete *Deen*: i.e., 1) Conquering the forces of nature and 2) Spending the benefits thus obtained according to Allah's revelation (وحی) for the welfare of entire humankind – *this* then becomes Islam, which includes both these parts. The result is: To make this world a place of heaven for human beings to work and lead their lives under universal welfare, justice, and peace. Therefore, if one part is there and the other is missing then it is *not* Islam.

Believing in one part and rejecting the other part

My dear friends, the Quran says: اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (2:85) – Do you, then, believe in one part of the divine writ and deny the truth of other part? Do you want to lead your life according to one part and reject the other part? The Quran calls the entire life as a book "کتاب". The book of nature is also "کِتَابِ اللّٰہِ". One of the great scientists has said: "We only read the book of nature. We cannot write it".

The Book of Allah and The Book of nature

My dear friends, humans can only read the book of nature. They cannot write it. The

Book of nature is nothing but Allah's book, and its other part is Allah's revelation or the Quran. When these two are together then only the *Deen* of Allah becomes complete. The Quran is questioning: Do you want to lead your life according to one and ignore or reject the other (2:85)? Well: فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ (2:85) – whoever will behave like this, the result will be: اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (2:85) – nothing but a life of humiliation and shame? This is the result of neglecting the Book of Nature. On the other hand, those who neglect the other Book of Allah, the Quran: وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (2:85) – when the Day of accountability arrives there will be severe punishment for them.

My dear friends, as far as we are concerned, it is not just the question that we ignored the Book of Nature but we have also ignored the Book of Allah, the Quran, and removed it from our consciousness and, as a consequence, we are suffering a double dose of severe punishment. We, who call ourselves Muslims, are suffering from self-deception and self-delusion. This is what religion (مذہب) does. This is what mysticism (تصوّف) does. Such a massive Universe Allah created for our benefit, and it teaches revulsion for it? The result: our overall deprivation and degradation and a permanent state of dependence and beggary. The true life of Islam is born from the integration of the two books of Allah. Conquering the forces of nature is extremely important, my dear friends! Without it we cannot move even one step in the direction of the universal human values dealing with the *Deen* related to humanity. Conquering the forces of nature is the means by which we reach the goal of the *Deen*. If one does not have the physical means to travel how one will reach the destination? How beautifully Iqbal explains: The life of Islam is: To open the door of *World* using the key of the *Deen*.

My dear friends, if someone thinks that the door of the world is worth despising then how can he open its door? How can a people do any anything in the world worthwhile who worship simply the key of the *Deen*? In fact, the key no longer remains *Deen* but it becomes مذہب. They take care of the key very well by putting it into silk covers suffused with fragrance inside beautiful marble buildings. These days Muslims are engaged in "worshipping the key" without bothering even to find out that the key has been given for a purpose – to open the door of the world, to conquer its forces.

To open the door of the world by the key of *Deen*

The Quran says that after conquering the forces of nature, using them based on a system of universal values given by Allah through the revelation *is* the *Deen* of Allah. Therefore, with this key every door of the world can be opened. *This* is the prescription of the Quran. It says: فَقَدَرْنَاۤ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ (77:23) – Thus have We determined the measure or laws for everything and excellent indeed is Our power to determine. Now the Quran brings to our attention the external Universe: (77:25-26) اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ۙ اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا – Have We not caused the earth to hold within itself the living and the dead? What to say of the Quran my friends! For a long time debates raged about whether the Earth is stationary or moving; whether it is round or flat. For a long time Western scientists also thought that the Earth was stationary. When Galileo declared that the Earth was not stationary but moves, he was imprisoned by the Church authorities and sentenced to death. Until the last moment the Church insisted that you will be released only if you renounce your statement. Galileo said that when my eyes are seeing that the Earth is moving then how can I say that it is stationary?

The proof of the validity of Iman

My dear friends, this is proof of Iman that "my eyes are seeing it". Galileo is providing the eyewitness account. This is called شہادت – literally meaning to provide an eyewitness account. When the call to prayer is made: اشہد لا الہ إلا اللہ – then these are mere words. But Galileo was providing the reality, he was proving the fact. He was an eyewitness to the reality.

The fatwa of the Chancellor of Medina University

My dear friends, those who had found the reality; those who had done the research about the Earth's movement continue their onward march, and who knows how far they will reach? But with us this debate is still there. Just few years ago the Chancellor of the Medina University gave a fatwa that anyone who believes that the Earth is moving had crossed the limit of Islam; and thus his marriage (نکاح) is abrogated. This is what is with us?! To illustrate our pathetic condition I gave you a high-level example. This fatwa is emanating from the Center of the Islamic world!

The meaning of the Earth being كِفَاتًا

My dear friends, when the Western scientists ponder on the words of the Quran they become rapturous. The Quran says: (77:25) – اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا – How wonderful is the choice of word by the Quran to explain the movement of the Earth. You may have noticed that birds –especially pigeons – suddenly stop flapping their wings in flight and keep flying, while their wings remain completely folded. This phase of their flight is quite silent and noiseless. This is called كِفَاتًا in Arabic. Thus when something as huge and as heavy as the Earth – with mean radius of 6,371 Kilometer and weight 5.9736×10^{24} Kilos – is moving then commonsense suggests that there must be some visible signs of its movement, like some noise or flutter or just something that reminds its inhabitants that it is moving. But there are no visible signs of its movement that human beings feel. Something that moves without producing any visible signs is called كِفَاتًا in Arabic. So, the Quran is asking: Have you not pondered that in spite of the fact that Earth is moving so fast you do not even notice any signs of its movement? The Earth carrying the dead and alive and everything in and on it moves at such great speed and you even do not notice it? There are no outward visible signs of its movement. Even jet planes make lot of noise, although there are no visible moving propellers. But the Earth does not produce any noise by its movement, despite being so huge and heavy.

There is another word in the Quran having similar meaning in: وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ (16:15), and in two other places (31:10) and (21:31). تَمِيدَ means "to remain in motion while carrying something". How beautifully the Quran explains the movement of the Earth – moving fast carrying everything in it; and humans do not even notice it! This was said more than 1400 years ago which the scientists discovered much later. Some ignorant ones feel that if the Earth is round and moving so fast then why don't people at its bottom fall off. What a great mercy it is of Allah that while the Earth is revolving and orbiting, we feel completely safe and sound. On the other hand, if we ourselves revolve round and round on the Earth then we fall to the ground very quickly. But we continue to spin (at 1,000 miles per hour) and revolve (at 67,000 miles per hour) with the Earth all our life and we do not even feel anything! Amazing!!

Inter-relationship among cosmic objects

My dear friends, what a system this is of planets and stars in the Cosmos! And don't ask of all the other things that are there besides the motion of these heavenly objects? There is another world of relationships among them. We were talking about movement of Earth without humans even noticing it. Then the Quran says: (77:27) وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا – and have We not set on it proud, firm mountains, and given you sweet water to drink? The word رَوَاسِيَ means big mountains but this word has connotation to movement. This word is also used for the anchors of ships to stabilize them during rough seas. The Quran says: (11:41) وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا – So Noah said to his followers: "Embark in this ship! In the name of God be its run and its riding at *anchor*!

Research on the role of mountains in Earth's movement

Geologists and Geophysicists are doing extensive research on the role that the mountains paly in the movement of the Earth at this high speed – a point on the Earth's equator travels about 1,000 miles per hour relative to its axis. What useful roles mountains paly in this movement only these researchers will be able to tell? However, as far as we are concerned, we read only for earning rewards.

Water from rocks

My dear friends, the Quran asks us ponder on these hard rocks. Apparently there is no sign of any moisture in them. But water springs out from within these rocks. Do you see how Our laws are working according to set patterns? The same way Our law of requital also works. But there is disaster waiting for those who belie this truth: (77:28) وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ – Woe on that Day unto those who give the lie to the truth!

Destruction and belying the Cosmic Quran

My dear friends! When the Quran says that those who belie the *Deen* there is destruction waiting for them, then this includes those as well, who belie Allah's book of nature, the cosmic Quran. Those who deny the movement of Earth and forces of nature (the cosmic Quran) or those who deny Allah's revelation contained in His book (Al-Quran) – both are equality guilty of belying the *Deen* of Allah. And sooner

or later, both are bound to face destruction – self-deceptions notwithstanding during the period of respite. My dear friends! One type of belying is that during the period respite one says: Where is God and where is His justice? The oppressed continue to be oppressed. No one is helping them and the oppressor continues to prosper. On one side is hopelessness and despair. On the other side is arrogance and transgression. This is the real world and its real problems. The Quran says that whether the belying is done in arrogance or in despair, both are due to ignorance and ambivalence; and the final result of both is destruction: اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (77:29) – GO ON towards that destruction which you were wont to call a lie!

Humans themselves go toward destruction – not vice versa

My dear friends, there is a great philosophy hidden in this word "انطلِقُو", and that is: The destruction does not go towards the humans but humans go towards the destruction. طلق (*Talaq*) means to freely go running towards something. The Quran says that they run towards their destruction. This is the automatic result of their belying the *Deen* of Allah. That is: (77:30-34)

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ; لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ; اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ; كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ; وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ

Go on towards the threefold shadow that will offer no shade and will be of no avail against the flame which – behold!- will throw up sparks like burning logs, like giant fiery ropes!

Suffocating canopy of scorching smoke

The Quran now gives examples of some heart-wrenching punishments such as being under a canopy of sizzling smoke. Its shade is highly suffocating and painful and ثَلٰثِ شُعَبٍ (77:30): it surrounds from three sides – left, right, and from top i.e., a punishment that surrounds them from all sides. Sometimes dust or sand storms come blocking the Sun engulfing large areas for several days. And fine dust particles hang in the air causing so much pain and suffocation that many start crying that the scorching Sun was better than this shade of scorching clouds! A shade is normally pleasant in hot Sun but this kind of shade traps heat and fine dust particles causing burning sensation and suffocation.

My dear friends, I have said many times that we cannot understand through our present consciousness the forms of punishment that will happen in the Hereafter. That is the reason the Quran presents these via examples. Anyway, they will happen after death. But rejecting or violating the part of the *Deen* that deals with life here will produce its results in perceptible form, here, in this world itself. And we see the destructive consequences of our transgressions every day all around us, and on television. What is the punishment that seems to engulf the entire humanity now? It is the result of recognizing and appropriating the first part of the *Deen* and extending its limits further and further – that of conquering the forces of nature – but rejecting the second part dealing with universal human values; the laws of Allah contained in His book to humanity, the Quran. The result? وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (77:34) – calamity and devastation. This is being repeated again and again by the Quran to emphasize that this is not coming from somewhere else, and for no reason. *This* is the result of belying the laws of Allah. Then, when the destruction finally arrives, there will be no need even to ask them about what crimes they committed: هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ (77:35) – Because it will be written on their forehead; the record of their deeds will be hanging around their necks unrolled and open. So much so that even their past hidden secrets of inside of their chests will come out into the open that day. They won't be allowed to present any excuses: وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ (77:36). There will be no question about it. If there is possibility of an excuse then what is the point of justice? Everything that day will be based on justice. The period of respite – that would have given them opportunity for reform and improvement – would have expired. That is their – i.e., those who belie the *Deen* of Allah in any form – final end: وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (77:37) – disaster and destruction.

My dear friends, time is over for today's lecture. We have reached verse 37 of Surah *Al-Mursalaat* (المرسلات). Although there are only few verses left in this Surah, we will take them in the next lecture.

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

☆.....☆.....☆